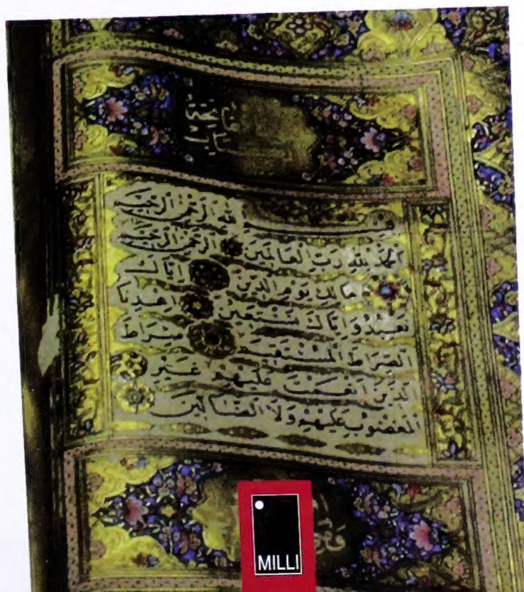
متحدہ اسلام

کا منشور

راشد شاز





منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

(اقبال)

متحدہ اسلام

کا

منشور

راشد شاز

ملی پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲۵

ISBN 978-93-81461-10-5

نامِ کتاب : متحدہ اسلام کا منشور
مصنف : راشد شاز
اشاعت اول : ۲۰۱۲ء
قیمت : پچاس روپئے (Rs.50/-)
مطبع : گلوریس پرنٹرس، نئی دہلی ۲

ناشر
ملّی پبلی کیشنز
ملی ٹائمز بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

Milli Times Building, Abul Fazl Enclave,
Jamia Nagar, New Delhi-25
Tel:. +91-11-26945499, 26946246
Fax: +91-11-26945499
Email:millitimes@gmail.com
www.barizmedia.com







ہمارے عہد کے شیعہ سنی اسلام سے اپنی وابستگی کے باوجود الگ الگ خانوں میں جیتے ہیں۔ ان کا ملی مفاد الگ، ان کی کتابیں الگ، ان کے علماء الگ حتی کہ ان کی مساجد بھی الگ الگ ہوگئی ہیں۔ صرف شیعہ سنی پر ہی موقوف نہیں، بلکہ مسلمانوں کے مختلف گروہ خواہ وہ اسماعیلی اور اباضی ہوں یا بعد کے عہد میں بننے والے سلفی، جماعتی، دیوبندی اور بریلوی مسالک کے حاملین، ان سبھوں نے اپنی اپنی مسجدیں الگ کرلی ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیے تو یہ حقیقت چھپائے نہیں چھپتی کہ مسجدیں ہوں یا مدرسے، بظاہر ان پر دینداری کا کتنا ہی خوشنما ملمع کیوں نہ چڑھا ہو اور ان کے مناروں سے اللہ اکبر کی صدا کیوں نہ سنائی دیتی ہو دراصل یہ تنگ نظری، تعصب اور فرقہ بندی کے قلعے بن کر رہ گئے ہیں جہاں خدائے واحد کی عبادت کے بجائے اپنے اپنے فرقوں اور مسلکوں کا علم بلند کیا جارہا ہے۔ بڑے قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ دراصل توحید کے مراکز نہیں بلکہ شرک اور فرقہ پرستی کے اڈے ہیں جو عین مسلم معاشرے کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔

پیش لفظ

متحدہ اسلام کا منشور کسی نئے اسلام کی تعمیر کی کوشش نہیں بلکہ اس آفاقی اور پیمبرانہ اسلام کی طرف واپسی کی دعوت ہے جس کا غیر محرف اور لازوال وثیقہ قرآن مجید کی شکل میں آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ البتہ رجوع الی القرآن کی یہ دعوت پچھلی تمام اصلاحی اور احیائی کوششوں سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ جہاں پچھلے مصلحین نے دینِ مبین میں در آنے والے فکری التباسات پر سکوت اختیار کرنے یا ان سے دامن بچا کر نکلنے کی کوشش کی ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جب تک امت غیر پیمبرانہ اجنبی حوالوں سے خود کو آزاد نہیں کرتی حبل اللہ المتین اس کے ہاتھوں میں دوبارہ نہیں آسکتی۔ سو لازم ہے کہ پوری دیانت داری کے ساتھ امتِ مسلمہ قرآن مجید کی روشنی میں اپنے غایت و اہداف اور فکری سفر کا بے لاگ محاسبہ کرے۔ پھر جو کچھ اسلام سے مغائر ہوا سے بلا تکلف ترک کر دیا جائے خواہ ایسا کرنے سے ہمارے اپنے محبوب فرقہ کی عمارت ہی کیوں نہ زمیں بوس ہو جاتی ہو۔

اسلام ایک چیز ہے اور اسلامی تاریخ ایک بالکل ہی دوسری چیز۔ اول الذکر جو رسالۂ محمدی سے عبارت ہے ایک لازوال پیغام ہے جس کی تکمیل کا شرف ہم متبعینِ محمد کو حاصل ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تاریخ متبعینِ محمد کے عہد بہ عہد تاریخی سفر کی داستان ہے۔ اس سفر میں عزیمت کے لحات بھی ہیں اور حوادث کے افسوسناک واقعات بھی۔ جب ہم من حیث الامت تاریخ کے ایک خاص مرحلے میں سیاسی نزاع اور فکری التباس کے سبب شیعہ سنی کے فرقوں میں بٹ گئے، جب فقہی اور کلامی موشگافیوں کے سبب ہم ائمۂ اربعہ کے خیموں میں منقسم ہو گئے اور شافعیوں اور حنفیوں کی باہمی خانہ جنگی کے سبب ہمارا ملی وجود لہولہان ہو گیا۔ کل اگر ہم فکری التباس کے باعث گروہوں میں بٹ گئے اور ہماری تلواریں آپس میں الجھ گئیں تو لازم نہیں کہ ان انسانی لغزشوں کو عقیدے کا سا اعتبار بخش دیا جائے اور اس کی اصلاح کو خارج از امکان قرار دے ڈالا جائے۔

انسانوں کے مابین اختلاف فکر و نظر کا پایا جانا کچھ نامحمود نہیں البتہ اختلاف کو عقائد کی حیثیت عطا کر دینا اور تشریح و تعبیر کی بنیاد پر مستقل فرقوں کا وجود میں آ جانا انتہائی قابل مذمت عمل ہے، ابتلائے شرک کا شاخسانہ ہے۔ ہمارے بڑے بوڑھے جنھوں نے دین کو ایک مجموعۂ اضداد کے طور پر قبول کر رکھا ہے وہ دل و دماغ کو اس لیے حرکت دینا نہیں چاہتے مبادا ان کے پسندیدہ اسلام کی بنیاد ہی نہ ہل جائے۔ دوسری طرف ہماری نئی نسل جو انٹرنیٹ کے عہد میں جیتی ہے وہ سخت کنفیوژن اور تشتتِ فکری کا شکار ہے۔ اسے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ رسول اللہ نے اپنے پیچھے اپنے متبعین کی جو متحدہ امت چھوڑی تھی وہ آگے چل

کر شیعہ، سنّی، اسماعیلی، اباضی جیسی شناختوں میں کیونکر منقسم ہوگئی۔ طرفہ یہ کہ اسلام کے متحدہ پیمبرانہ قالب کے غیاب پر آج ہمارے دل افسردہ اور آنکھیں نمناک بھی نہیں۔ ہر گروہ بڑی بے شرمی اور کمال ہٹ دھرمی سے اپنے آپ کو احق ثابت کرنے پر مصر ہے۔ ہمارے ذہین نوجوانوں کے لئے، جن کی دسترس میں اب تمام ہی امہات الکتب اور فقہی وکلامی سرمایہ ہے اور جو keyboard پر انگلیوں کی معمولی جنبش سے دقیق مباحث اور علمی وثائق کے انبار لگا سکتے ہیں، ان کے لئے یہ سمجھنا سخت مشکل ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کا چار ائمہ کی اتباع میں باہم منقسم ہو جانا آخر قرآن کی کس تعلیم کے سبب ہے؟ ابو حنیفہ ہوں یا شافعی، یا سنّی شیعہ فرقے کے دوسرے کبار مؤسسین۔ ان سبھوں کو اللہ نے مبعوث کیا اور نہ ہی انہیں رسول اللہ کی صحبت ملی۔ پھر ان حضرات کو دین کے مؤسس اور لازوال شارح کی حیثیت کیونکر حاصل ہے؟ ان کی اتباع کو مسلمانوں کے مختلف گروہوں نے کیوں اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے؟ صدرِ اول میں جب مسلمان ایک امت تھے، جب یہ فقہی، مسلکی اور گروہی بانیان تاریخ کے افق پر نمودار نہیں ہوئے تھے، ہماری ملّی اور مذہبی زندگی کا کاروبار کہیں بہتر انداز سے جاری تھا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ آج ان کی مداخلتوں کے بغیر دینی زندگی کی بساط سجائی نہ جا سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے ہاتھوں میں اسلام کی امانت سونپی تھی۔ صدر اول میں اس پیغام کے حاملین خود کو مسلمان کہا کرتے تھے کہ انہیں اللہ نے اسی شناخت سے متصف کیا تھا۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ خدا کی عطا کردہ اس شناخت پر شیعہ، سنّی جیسی تراشیدہ شناختیں غالب آگئیں اور پھر یہ سلسلہ

یہیں نہ رکا بلکہ ان فرقوں کے اندر بھی بھانت بھانت کی فقہی اور جماعتی گروہ بندیاں نمودار ہو گئیں۔ طرفہ یہ کہ ہر فرقہ اور جماعت نے قرآن مجید کے متفقہ اور لازوال پیغام کے بالمقابل اپنی اپنی مذہبی کتابوں، آثار و روایات کے لاطائل دفتروں اور مناظرانہ فقہی موشگافیوں کی ایک الگ دنیا آباد کر ڈالی اور اس طرح رسالۂ محمدی سے اس کا تعلق منقطع ہو کر رہ گیا۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ دین کے نام پر بدترین قسم کی فرقہ بندی اور باہمی منافرت نے پوری امت کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ دینی درسگاہیں ہوں یا وعظ و ارشاد کی مجلسیں، تبلیغ و تعلّم کا غلغلہ ہو یا ذاکروں کی معجز بیانیاں، بہ نظرِ غائر دیکھیے تو صاف محسوس ہوگا کہ یہ سب لوگ دراصل اسلام کی آفاقی دعوت سے منہ موڑ کر، بلکہ اس کی تکذیب کرتے ہوئے، فرقہ بندی اور گروہی تعصبات کی جوت جگا رہے ہیں۔ گویا دین اور تبلیغِ دین کے نام پر چہار سو جو خلفشار بپا ہے، اس کا اس اسلام سے کوئی تعلق نہیں جو اپنے ماننے والوں کو توحید کی وحدت میں پرو دیتا اور انھیں ایک ناقابلِ تسخیر بنیان مرصوص میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اسلام کے گمشدہ متحدہ قالب کی بازیافت اور اسے فی زمانہ ازسرِ نو منقّح کرنا اہلِ قبلہ کے تمام ہی طائفوں کی مشترکہ ملّی ذمہ داری ہے۔ اس عمل سے صرف ہمارا ملی مستقبل ہی نہیں بلکہ تمام ہی اقوامِ عالم کا اجتماعی مفاد وابستہ ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا مقصد دراصل بازیافت کے اسی عمل کو مہمیز کرنا ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ امت کے مختلف فرقے اپنے اصل نظری سرمائے کی بازیافت اور اپنی مشترکہ شناخت کی تعمیرِ نو کے لئے سر جوڑ کر بیٹھیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو آج

خود کو مسلمانوں سے الگ سمجھتے ہیں یا جو تاریخ کے کسی مرحلے میں ہم سے جدا ہو گئے لیکن ماضی میں وہ ہمارے قافلے کا حصہ رہے ہیں انہیں بھی دوبارہ اس نبوی دائرے میں لانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ بین المذاہب، بین الفرق بلکہ بین الجماعت اور بین المسالک مکالموں کی ابتدا بھی اس مقصد کی راہ میں حائل برف کو پگھلا سکتی ہے۔ اگر تمام ہی فرقے احساسِ زیاں کے ساتھ اپنے اصل نظری گھر یعنی پیمبرانہ اسلام میں اپنی واپسی کا عزم کر سکیں تو ایک مشترکہ جدوجہد کا ڈول ڈالا جانا عین ممکن ہے۔

اس کتاب میں تاریخی حوالوں اور مصادر کے تذکرے سے دانستاً اجتناب کیا گیا ہے تاکہ اس کے اختصار اور عام فہم اسلوب کو برقرار رکھا جا سکے۔ البتہ جو لوگ علمی حوالے اور تفصیلی مطالعے کے خواہشمند ہوں انہیں چاہیے کہ وہ ادراک کی دونوں جلدوں اور کتاب العروج کا مطالعہ ضرور کریں جہاں ہمارے ہزار برسوں کی دانشورانہ تاریخ اور عہد بہ عہد در آنے والے التباسات و انحرافات کا تذکرہ علمی حوالوں اور مصادر کی نشاندہی کے ساتھ موجود ہے۔

اس کتاب کی اشاعت سے ربع صدی سے زائد عرصے پر محیط رسالۂ محمدی کی بازیافت کا عمل اب علمی تحقیق و تجزیہ، غور و فکر اور نالۂ نیم شبی سے نکل کر عملی اور اطلاقی مرحلے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس توفیقِ خاص اور مہلتِ عمر کے لئے اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

راشد شاز

علی گڑھ، ۵ رمئی ۲۰۱۲ء

futureislam@gmail.com

متحدہ اسلام کا منشور

کیا آپ مسلمان ہیں؟ اے کاش کہ اس سوال کا جواب اثبات میں ہوتا لیکن اسے ہماری بدقسمتی کہیے کہ فی الواقع ایسا ہے نہیں۔ جب آپ کسی مسلمان سے یہ پوچھتے ہیں کہ وہ کس قسم کا مسلمان ہے، کس گروہ یا مسلک سے اس کا تعلق ہے، کس جماعت یا شیخ کے سلسلے سے وہ منسلک ہے، وہ شیعہ ہے یا سنی، اسماعیلی ہے یا اباضی، حنفی ہے یا شافعی، مسلکِ دیوبند پر عامل ہے یا سلفِ صالحین کے راستے پر گامزن تو اس مفروضہ سے ہوا نکل جاتی ہے کہ ہم مسلم محض (حنیفا مسلما) اور صرف اور صرف اسلام پر عامل ہیں۔

فی زمانہ جب دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کوئی پونے دو ارب تک جا پہنچی ہے اور دنیا کا کوئی بھی قابلِ ذکر خطہ ہماری چلت پھرت سے خالی نہیں، یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوتی ہے کہ انسانوں کے اس انبوہِ کثیر میں خود کو صرف اور صرف مسلمان کہنے والے اور اسی شناخت پر جم جانے والے لوگ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص مختلف قسم کی فرقہ بندیوں کا اسیر ہے اس

کی شناخت اب اس کے فرقہ کے حوالے سے ہوتی ہے اور پھر اس فرقہ کے اندر بھی مختلف قسم کی فقہی گروہ بندیاں قائم ہیں اور پھر ہر خیمہ میں تقسیم در تقسیم کا عمل جاری ہے۔ گویا آج کا مسلمان اپنے مسلمان بنے رہنے کے لیے یہ لازم جانتا ہے کہ وہ سب سے پہلے شیعہ ہو یا سنی اور اگر سنی ہے تو چار ائمہ فقہاء میں سے کسی ایک کے فقہی خیمہ سے بھی وابستہ ہو۔ یہ تو کم از کم تقسیم ہے جس کے بغیر مسلمان ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اب انھیں یہ کون بتائے کہ فقہ و مسالک کے نام پر وجود میں آنے والی یہ مختلف قسم کی گروہ بندیاں اسلام کی دعوتِ توحید سے حد درجہ مغایرٗ بلکہ متصادم ہیں۔ توحید انسانوں کو خدائے واحد کی غیر مشروط عبودیت کے حوالے سے ایک لڑی میں پروتا ہے۔ عرب و عجم، سیاہ و سفید، امیر و غریب، آقا اور غلام ہر کوئی اس ابدیت کے رشتہ میں خود کو ایک دوسرے کا شریک و سہیم پاتا ہے۔ حبشہ کے بلال اور فارس کے سلمان اسلام کے حوالے سے ایک بین الاقوامی ایمانی برادری کی تشکیل کرتے ہیں۔ گو کہ ان کا تعلق دنیا کی مختلف قوموں اور خطوں سے ہوتا ہے لیکن حلقۂ توحید میں شمولیت کے بعد اب ان کا دینی، ملی، سیاسی، جغرافیائی مفاد ایک ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ہی مقصد کے لئے جیتے اور ایک ہی مقصد کے لیے مرتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے عہد کے شیعہ سنی اسلام سے اپنی وابستگی کے باوجود الگ الگ خانوں میں جیتے ہیں۔ ان کا ملی مفاد الگ، ان کی کتابیں الگ، ان کے علماء الگ حتیٰ کہ ان کی مساجد بھی الگ الگ ہو گئی ہیں۔ صرف شیعہ سنی پر ہی موقوف نہیں، بلکہ مسلمانوں کے مختلف گروہ خواہ وہ اسماعیلی اور اباضی ہوں یا بعد کے عہد میں بننے

والے سلفی، جماعتی، دیوبندی اور بریلوی مسالک کے حاملین، ان سبھوں نے اپنی اپنی مسجدیں الگ کرلی ہیں۔کون سی مسجد کس مسلک کی ہے اس کا اندازہ اس مسجد میں پائی جانے والی دینی کتابوں سے بآسانی ہوجاتا ہے۔ذرا باریک بینی سے دیکھیے تو یہ حقیقت چھپائے نہیں چھپتی کہ مسجدیں ہوں یا مدرسے، بظاہران پر دینداری کا کتنا ہی خوشنما ملمع کیوں نہ چڑھا ہوا وران کے مناروں سے اللہ اکبر کی صدا کیوں نہ سنائی دیتی ہو دراصل یہ تنگ نظری، تعصب اور فرقہ بندی کے قلعے بن کر رہ گئے ہیں۔ یہاں خدائے واحد کی عبادت کے بجائے اپنے اپنے فرقوں اور مسلکوں کا علم بلند کیا جارہا ہے۔بڑے قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ دراصل توحید کے مراکز نہیں بلکہ شرک اور فرقہ پرستی کے اڈے ہیں جو عین مسلم معاشرے کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ بظاہر چونکہ انھوں نے اپنے اوپر ورع اور تقویٰ کا نقاب ڈال رکھا ہے اور اس لیے اس کی سنگینی کا اگر احساس بھی ہوتا ہے تو ہم بآہنگ بلند اس صورت حال پر لب کشائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔مسلکی اور گروہی مسالک ومساجد پر ہمارا یہ تبصرہ کسی شدتِ احساس کے سبب نہیں بلکہ قرآن مجید کے اس فتویٰ کے سبب ہے جس سے ہمارے علمائے عظام یقیناً ناواقف نہیں ہیں: ان الذین فرقوا دینهم و کانوا شیعا لست منهم فی شئی انما امرهم الی الله ثم ینبئهم بما کانوا یفعلون۔(الانعام ۱۵۹)

فرقہ بندی شرک ہے۔گروہی عصبیت یا مسلکی شناخت کو جولوگ ہوا دیتے ہیں یا جولوگ اسلام اور مسلمان کے علاوہ کوئی اور شناخت اپنے لیے پسند

کرتے ہیں اور اس کی ترویج واشاعت میں اپنی قوت صرف کیے دیتے ہیں در حقیقت وہ خدائے واحد کا دامن چھوڑ کر شرک کے راستہ پر چل نکلتے ہیں، ان کے ہاں اسلام کی کوئی خوبو نہیں رہ جاتی۔ ذرا غور کیجیے یہ کیسی تکلیف دہ صورت حال ہے کہ ایک ہی رسولؐ کی امت دین یا فہم دین کے نام پر مختلف گروہوں میں بٹ گئی ہے۔ شیعہ درسگاہوں میں دین کی شیعی تعبیر کو احق ثابت کرنے اور سنیوں کو گمراہ باور کرانے پر اصرار جاری ہے۔ دوسری طرف سنّی مدارس میں اہل سنت والجماعتؒ کے موقف کو سبیل المومنین باور کرانے پر صدیوں سے قوت صرف ہو رہی ہے۔ پھر ان سنی مدارس میں بھی اگر شوافع اپنے علماء کی تقدیس وتحمید میں مصروف ہیں تو احناف کو یہ زعم ہے کہ دین کو سمجھنے کے لیے اقوال بزرگاں کی سند سے بہتر کوئی اور دلیل نہیں ہوسکتی۔ اگر خدا نے چشمِ بینا دے رکھی ہو تو ہمیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگنی چاہئے کہ مساجد و مدارس اور خانقاہوں میں، جنھیں ہم بسبب فریب نظر دین کا قلعہ سمجھتے ہیں، دراصل دین کی تکذیب اور اپنے اپنے فرقوں کی تکبیر وتہلیل کا عمل جاری ہے۔ کہیں تشیع کے خلاف علمی جہاد کے لیے طلباء کو تیار کیا جا رہا ہے تو کہیں بریلویت کا قلعہ زمین بوس کرنے کی تیاری چل رہی ہے، کہیں مسلک دیوبند کو احق اور افضل ثابت کرنے کے لیے طلباء میں باہم مشقی مناظرے (mock-debate) منعقد کرائے جا رہے ہیں، اور کہیں کسی خاص شیخ کی روحانی بیعت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنے کی جدوجہد چل رہی ہے۔ دین کے نام پر گروہی عصبیت کے فروغ اور فرقہ بندی کے استحکام کا یہ مذموم کاروبار امت کو اس کے اندر سے مسلسل

کچھ کے لگا رہا ہے۔ دین کی یہ مختلف تعبیریں اور ان کی بنیادوں پر وجود میں آنے والی یہ فرقہ بندیاں خواہ ایک دوسرے کے سلسلے میں کتنے ہی توسع اور وسیع القلبی کا دعویٰ کریں واقعہ یہ ہے کہ ان تمام فرقوں کا قیام ایک دوسرے کے استرداد سے غذا حاصل کرتا ہے۔ اگر شیعہ سنیوں کے خلاف اپنا سیاسی مقدمہ واپس لے لیں تو پھر بارہ اماموں کو منصوص ماننے اور ان کی اتباع کا کوئی جواز نہیں بچتا۔ اسی طرح اگر سنی شیعوں پر انحراف کا الزام نہ لگائیں تو ان کے لیے ائمہ اثنا عشر کے بغیر دینی زندگی جینے کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔ شیعہ اور سنی اس وقت تک یک جان دو قالب نہیں ہو سکتے اور یہ منتشر امت اس وقت تک بنیان مرصوص نہیں بن سکتی جب تک کہ شیعہ اپنی شیعیت کو خیر باد نہ کہہ دیں اور سنی اپنی سنیت سے دستبردار نہ ہو جائیں۔ گو کہ بظاہر یہ ایک بڑا مشکل کام معلوم ہوتا ہے لیکن اگر دلوں میں شرک کو ترک کرنے اور توحید کو اختیار کرنے کا واقعی داعیہ پایا جاتا ہو تو یہ ناممکن بھی نہیں۔

تاریخ کے اتنے بڑے انحراف کی درستگی جس پر کوئی ہزار سال کا عرصہ بیت چکا ہے اور اس طویل عرصہ میں دونوں فرقے بظاہر بقائے باہم اور بباطن استردادِ باہمی کے راستے پر جس طرح گامزن رہے ہیں اور جسے ان دونوں فرقوں نے معتبر دین کا نام دے رکھا ہے، اس منافقانہ رویہ کی بساط لپیٹنا یقیناً ایک بڑا مشکل کام ہے۔ البتہ ہزار سال کے اس تکلیف دہ تجربہ کے بعد آج پہلے سے کہیں زیادہ ہم اس بات کو سمجھنے کی پوزیشن میں ہیں کہ جب تک ہمارے اندرون میں اتحاد پیدا نہیں ہوتا، جب تک ہم اپنے گھر کو درست نہیں کرتے ہم باہر کے

دشمنوں سے کسی فیصلہ کن معرکہ آرائی کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔

ذرا غور کیجئے! کیا یہ حقیقت نہیں کہ منگول حملہ آور جب عباسی خلیفہ کی علامتی روحانی ہیبت کے سبب بغداد میں داخلہ سے گریزاں تھے اس وقت اس سنّی خلافت کا چراغ گل کرنے کے لیے انھیں ایک شیعی عالم نصیر الدین طوسی کی ترغیب وترہیب حاصل تھی اور اسی طرح قلعۂ الموت میں جب فاطمی خلافت کی باقیات کو منگول تباہ کرنا چاہتے تھے تو انھیں ایک سنّی عالم علاء الدین عطا ملک جوینی کی معیت اور حمایت حاصل تھی۔ چوتھی صدی ہجری سے، جب ہم مختلف خانوں میں بٹ گئے، اور جب ہمارے ہاں بیک وقت متبادل خلافتیں قائم ہوگئیں ہماری قوتوں کا بڑا حصہ اپنے فرقہ کے استحکام اور دوسرے فرقوں کی بیخ کنی پر صرف ہوتا رہا۔ کیا ہم اس تاریخی حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ عہد فاطمی میں جامعہ ازہر کی دینی درسگاہ کے قیام کے بعد جسے فاطمی مسلک کی ترویج واشاعت کے لیے قائم کیا گیا تھا، ہمارے ہاں شرعی علوم کے نام پر جتنی بھی درسگاہیں قائم کی گئیں وہ ابتداً فاطمیین کا زور توڑنے کے لیے سیاسی مصالح کے تحت قائم ہوئی تھیں۔ اسماعیلی یا فاطمی اسلام کے مقابلے میں نظامیہ بغداد کے مدرسے وجود میں آئے، خانقاہوں اور تکیوں کو ہوا دی گئی اور اس طرح چوتھی صدی ہجری سے عالم اسلام میں علمِ دین کے نام پر سیاسی اور مسلکی فرقہ بندی کے کارخانے قائم ہوگئے۔ فاطمی اور عباسی خلافتیں تو اپنے زوال کے سبب تاریخ کے صفحات میں غائب ہوگئیں البتہ اس عہد میں ظہور پذیر ہونے والی فرقہ بندی اور مسلکی وفقہی شناخت سے آج تک ہمارا پیچھا نہ چھوٹ سکا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ

گزرے وقتوں کے ساتھ دین کی یہ منحرف تعبیرات، فرقہ بندی اور گروہی تعصب کو مسلسل فروغ دیتی رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب اس امت میں ڈھونڈے سے بھی ایسے لوگ نہیں ملتے جو یہ کہنے کی جرأت کرتے ہوں کہ وہ صرف اور صرف مسلمان ہیں۔ شیعہ، سنی، اسماعیلی، اباضی، علوی، دروزی اور ان جیسی دیگر غیر اسلامی شناختوں سے ان کا دامن یکسر پاک ہے اور یہ کہ وہ کسی ابوحنیفہ یا کسی شافعی پر ایمان نہیں لائے ہیں۔

ایک نئی ابتداء کی ضرورت

بظاہر یہ خیال عجیب معلوم ہوتا ہے کہ جس فرقہ بندی کو شرک کے بجائے عین اسلام سمجھ لیا گیا ہے اور جسے آج امت کا سوادِ اعظم رسالۂ محمدی سمجھے بیٹھا ہے، اس کی بنیادوں پر شبہات وارد کیے جائیں۔ ہوسکتا ہے آپ کے دل میں یہ خیال آئے کہ ہم جن گروہ بندیوں کو عین دینِ اسلام سمجھتے رہے ہیں، اور جس پر کم وبیش ہزار برسوں سے عامل بھی ہیں اچانک آج ان بنیادوں کو ساقط الاعتبار قرار دینے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ اس امت میں ان ہزار برسوں میں نہ جانے کتنے علماء ومفکرین پیدا ہوئے، نہ جانے کتنے شارحین اور متکلمین نے جنم لیا، آخر ان لوگوں نے اس انحراف عظیم کی طرف کیوں نہ اشارہ کیا جس کی نشاندہی آج میں کوئی ہزار سال بعد کر رہا ہوں؟ اس دوران امت میں غزالی اور ابن تیمیہ جیسے متکلمین پیدا ہوئے تو شاہ ولی اللہ اور محمد بن

عبدالوہاب جیسے احیائی بھی، اور پھر بیسویں صدی میں، سقوط خلافت کے بعد، افغانی کے شاگردوں، اقبال کے مدّاحوں، حسن البنا، مولانا الیاس اور ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریکوں نے بھی اس انحراف کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی دعوت نہ دی۔ بلکہ ان سبھوں کا رویہ یہ رہا کہ اس مجموعۂ اضداد کو ساتھ لے کر چلا جائے کہ یہ وہ مرض مزمن ہے جس کا علاج ممکن نہیں، یہ وہ انحراف ہے جس کی درستگی اب انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ یہ تو باور کراتے ہیں کہ اصل مسالکِ فقہی صرف دو ہیں، حنفی اور شافعی اور بقیہ دو ان کے اندر ہی سمو جاتے ہیں۔ البتہ وہ اس خیالِ باطل سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا پاتے، جیسا کہ ان کا کہنا ہے، کہ فقہائے اربعہ کا ظہور ایک اعتبار سے من جانب اللہ ہے۔ غزالی تو خیر سے فضائح الباطنیہ لکھنے کے سبب عباسی موقف کے وکیل سمجھے جاتے تھے۔ البتہ ابن تیمیہ، جن کی شناخت بیک وقت ایک مجاہد اور مجدد کی حیثیت سے ہے، ان کا بھی حال یہ ہے کہ وہ شیعوں کے بارہ اماموں کو تو ایک انحراف سے تعبیر کرتے ہیں، البتہ وہ شیعہ عالم علامہ حلّی کے اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیتے کہ اگر بارہ امام کا تصور غلط ہے تو ان چار سنّی اماموں کا دینی جواز کیا ہے؟ مختلف فرقوں کی کتابیں پڑھیے اور ان کا موقف سمجھنے کی کوشش کیجیے تو سخت کوفت ہوتی ہے کہ جن امور کو ان حضرات نے اپنے اپنے حلقوں میں دینی امور باور کرا رکھا ہے اور جس کی تعلیم و تعلم سے ان سبھوں کی دینی درسگاہیں آباد ہیں، وہ دراصل عہد رفتہ کی سیاسی گروہ بندیاں ہیں، دین اور غایتِ دین سے انھیں کچھ بھی علاقہ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان فرقہ وارانہ تعبیرات نے دینِ مبین کی شکل جتنی

مسخ کی ہے اور دین اسلام جس قدر ان مناقشوں میں پامال ہوا ہے اس کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک ہم ان تمام فرقوں کی دینی کتب کو یکساں معروضیت کے ساتھ پڑھنے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں۔

رہی یہ بات کہ انحراف کو محض اس لیے قبول کرلیا جائے کہ اس پر ایک ہزار سال کی شہادت موجود ہے یا فرقہ بندی کو محض اس لیے انگیز کرلیا جائے کہ یہ صدیوں سے چلا آتا ہے تو یہ ایک ایسا رویہ ہے جس پر دین وشریعت اور عقل سے دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ اسلام جو وجدنا آباء نا کذالک یفعلون کی سخت نکیر کرتا ہے، اس کا یہ مطالبہ ہے کہ اقوال بزرگاں اور سنت سلف اگر وحی اور عقل سے متصادم ہو تو اسے اعتبار نہ بخشا جائے۔ نزولِ قرآنی نے صدر اول کے معاشرے کو جس طرح توحید کی وحدت پر قائم کیا تھا اسی طرح آج غیاب نبوی میں متبعین محمدؐ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قرآنِ مجید کے لازوال اور غیر محرف پیغام کی روشنی میں مسلسل اپنا قبلہ درست کرتے رہیں۔ گویا غیاب نبوی میں قرآن مجید اور اسوۂ حسنہ، جس کا سب سے مستند ماخذ خود قرآن مجید ہے، کی روشنی میں امت کے ارباب حل وعقد پر یہ لازم آئے گا کہ وہ اپنے فکر وعمل کا مسلسل جائزہ لیتے رہیں۔ پھر جو کچھ اس کے مطابق ہو اسے برقرار رکھیں اور جو کچھ اس کے برخلاف ہو اسے بلاتکلف مسترد کردیں خواہ اس کی پشت پر صدیوں کے منحرف تاریخی عمل اور سادہ لوح سلفِ صالحین کے قول وعمل کی شہادت کیوں نہ پائی جاتی ہو۔

اس مسئلہ پر ایک اور پہلو سے غور کیجیے۔ محض کسی انحراف کی قدامت یا اس کا مقبول عام ہو جانا اس کی صحت کی دلیل نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کوئی ایسا انحراف

یا کوئی ایسی غلطی محض قدیم ہو جانے کے سبب اصلاح کا امکان کھو دیتی ہے۔ کیا آپ اس تاریخی حقیقت سے واقف نہیں کہ فرح بن برقوق، جسے مورخین نے بدترین بادشاہوں میں شمار کیا ہے، نے اپنے عہد میں مسلکی خانہ جنگیوں سے تنگ آکر حرم کعبہ میں چار فقہاء کے الگ الگ مصلے قائم کردیے تھے جس کے نتیجے میں کوئی پانچ سو سالوں تک حرم مکی میں ایک ہی امت چار الگ الگ اماموں کی اقتداء میں نمازیں پڑھتی رہی۔ اس دوران امت میں بڑے بڑے فقہاء و متکلمین پیدا ہوئے لیکن اس انحراف کو ختم کرنے کی کسی میں جرأت نہ ہوئی یہاں تک کہ نجدی تحریکِ اصلاح نے بیسویں صدی کی ابتداء میں حجاز پر اپنے قبضہ کے بعد لوگوں کو ایک مصلیٰ پر جمع کردیا۔ اور اب جب اس عمل پر کوئی پون صدی کا عرصہ گزر چکا ہے، کسی کو اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ چار علیحدہ مصلوں کے لپیٹ دینے سے ہماری نمازوں میں کوئی فقہی خلل واقع ہو گیا ہو۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان جیسے دوسرے انحرافات کی درستگی کو ناقابلِ عمل سمجھا جائے۔

اے کاش کہ ہمیں اس بات کا احساس ہوتا کہ ہمارے ملی گراف کا مسلسل نیچے گرتے جانا دراصل ہماری باہمی نظری خانہ جنگی کے سبب ہے جس نے شیعہ، سنی، حنفی، شافعی، بریلوی، دیوبندی اور بھانت بھانت کے مختلف گروہوں کو باہم ایک دوسرے سے برسرِ پیکار کر رکھا ہے۔ کوئی ہزار سالوں پر محیط باہمی منافرت کا یہ سلسلہ تھامے نہیں تھمتا۔ بلکہ گزرتے وقتوں کے ساتھ اس کی لو مسلسل تیز ہوتی جاتی ہے۔ بھلا ایسی صورت میں یہ امت اقوامِ عالم کی رہنمائی تو کجا خود اپنے لیے ایک پرسکون اور روشن مستقبل کا تصور بھی کیسے کر سکتی ہے۔

۱۱۱۹۰۱

شترمرغی مسائل کو مؤخر ضرور کرتی ہے لیکن اس سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ ان کی سنگینی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ صدیوں سے ہمارے صلح جو مصلحین اس خیال کا اعادہ کرتے رہے ہیں کہ شیعہ سنی سب ہی اپنی اپنی جگہ برحق ہیں اور اسی طرح چار سنی مسالک اپنے باہمی افتراق وانتشار کے باوجود دین کی مستند تصویر پیش کرتے ہیں۔ دراصل اس قسم کے مغالطوں نے ہمیں اصل مسائل کے ادراک سے روکے رکھا ہے۔ اب محض یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ خدائے واحد کی عطا کردہ حنیفا مسلما کی شناخت کو ترک کرنے والے لوگ جو فرقہ پرستی، ائمہ پرستی، شیوخ پرستی اور ان جیسی دیگر پرستشوں میں مبتلا ہیں اور جنھوں نے علی الاعلان خدائے واحد کے بجائے اپنے اپنے فرقے اور گروہ کا علم بلند کر رکھا، یہ سب کے سب بیک وقت حق پر ہیں کہ ایسا کہنا وحی اور عقل دونوں کا انکار ہے۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا، قرآن کا فرمان ہے کہ اے محمد جن لوگوں نے دین میں فرقہ بندی کو ہوا دی اور گروہوں میں بٹ گئے ان کا تم سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا۔ موٹی سے موٹی عقل والا آدمی بھی اس نکتہ سے ناواقف نہیں کہ جن لوگوں نے امت مسلمہ میں اپنی الگ گروہی شناخت بنائی انھوں نے دراصل سبیل المومنین سے بغاوت کا علم بلند کیا۔ امت کا مفاد اور اس کی قوت فرقوں کے خاتمے میں ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ امت کے تمام ہی فرقے جنھوں نے مسلمانِ محض کی شناخت کو خیر باد کہتے ہوئے غیر اسلامی شناختوں کا علم بلند کیا، جو شیعہ، سنی، حنفی، شافعی ہو گئے، اور جن کے ہاتھوں سے حبل اللہ المتین پھسل گئی، وہ سب بیک وقت برحق ہوں۔

پیمبرانہ اور تاریخی اسلام میں فرق

مسلمانوں میں فرقہ بندی کا ظہور اور مختلف چھوٹے چھوٹے سیاسی، فقہی اور نسلی خیموں کا قیام تاریخ کے مختلف ادوار میں عمل میں آیا ہے۔ صدر اول کا اسلام ان اتہامات اور آلائشات سے یکسر پاک تھا۔ اگر ہم اپنی دانشورانہ تاریخ کا کسی حد تک ادراک رکھتے ہوں تو ہمارے لیے گروہی تعصبات پر قابو پانا اور فریق مخالف کے نقطۂ نظر کو سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا۔

اسلام کی ابتدائی تین صدیوں میں مسلمان اپنے تمام تر اختلافِ فکر ونظر کے باوجود ایک امت تھے۔ شہادتِ عثمانؓ سے لے کر جمل اور صفین کی خانہ جنگیاں اور پھر آگے چل کر اموی اور عباسی انقلابات کے باوجود دین کے نام پر گروہ بندیوں کا وجود نہ تھا۔ گو کہ اس دوران ائمہ اہل بیت کے حوالے سے مختلف چھوٹے بڑے خروج عمل میں آتے رہے، لیکن آل بویہ کی امیر الامرائی کے قیام سے پہلے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ اسلام کا اثناعشری قالب کسی الگ نظری شناخت کا حامل ہو سکتا ہے۔ نہ فاطمین کی خلافت سے پہلے اسماعیلی اسلام کی باطنی تعبیرات کو ایک متبادل اور مسلمہ فکر کی حیثیت حاصل تھی اور نہ ہی عباسیوں کے منصۂ شہود پر آنے سے پہلے سنی اسلام کے خدوخال واضح ہو پائے تھے۔ تب پوری امت اپنے تمام اختلافِ فکر ونظر کے باوجود ایک وحدت تھی۔ کسی کو اثناعشری، سبعیہ یا قطعیہ کا نام دینا مخالفین کا پروپیگنڈہ سمجھا جاتا تھا۔ کوئی اپنے آپ کو اھل العدل و الا ستقامہ کہتا تو کسی کو یہ دعویٰ تھا کہ اس کا موقف سبیل المومنین کا آئینہ دار ہے۔ ابتدائی تین صدیوں تک اہل علم

کے حلقے، فقہ و روایت کے دبستان اور روایتوں کے مجموعے تمام ہی گروہوں کی مشترکہ میراث سمجھے جاتے تھے۔ بخاری و مسلم اور ان جیسے دسیوں مجموعے، جن کے تذکرے تاریخی مصادر میں مذکور ہیں، تمام ہی مکاتب فکر کے لیے یکساں دلچسپی کا باعث تھے۔ روایات کے ان مجموعوں میں بیک وقت شیعہ سنی رجحانات کی حامل روایتیں پائی جاتی تھیں۔ آج بھی مسلم میں خمرۂ نماز یا متعہ جیسی شیعی روایتیں موجود ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ غدیر خم کی شیعی روایت مسند احمد جیسے سنی دفتر حدیث میں اپنی تمام تر آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس کے علاوہ بخاری میں بوقت وصالِ نبیؐ وصیت کے قلمبند کیے جانے کا ذکر اور اس کو مؤخر کرنے کے لیے حضرت عمرؓ کا حسبنا کتاب الله کا اصرار اور اس قسم کی دسیوں ایسی روایتیں موجود ہیں جس سے شیعہ علماء اپنے موقف کی صحت پر دلیل لاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ چوتھی صدی کی ابتداء تک چونکہ شیعہ سنی کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم عمل میں نہیں آئی تھی سو بخاری اور مسلم جیسے جامعینِ حدیث امت کے مجموعی رجحان کے نمائندہ سمجھے جاتے تھے۔ البتہ جب چوتھی صدی کے پہلے ربع میں شیعوں نے اپنی روایات کے مجموعے الگ کر لیے تو ان متروکہ کتابوں کو سنی ماخذ حدیث کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ علیحدہ شیعہ فکر کی تشکیل و تدوین کا تمام تر علمی کام، جس نے اسے ایک منفرد فکری گروہ کی حیثیت سے متعین کیا آلِ بویہ کی امیر الامرائی میں انجام پایا۔ کلینی کی جمع کردہ روایتوں کے مجموعے محض ایک علمی کارنامے کی حیثیت سے زندہ رہتے اگر انھیں عہد آلِ بویہ میں شیعہ امہات الکتب کی حیثیت سے اختیار نہ کیا جاتا اور اگر شریف رضی اور مرتضیٰ کے ہاتھوں

نہج البلاغہ کی ترتیب وتدوین نہ ہوتی اور اگر اسی عہد میں نجف اور کربلا کی زیارت گاہیں وجود میں نہ آتیں تو شیعی اسلام کا ایک علیحدہ قالب وجود میں نہ آتا۔ بالکل اسی طرح اگر قاہرہ میں فاطمی خلافت قائم نہ ہوتی، جامعہ ازہر میں دعائم الاسلام کا درس جاری نہ ہوتا اور اسماعیلی امامت پر دلیل لانے کے لیے علماء ودعاۃ، مبلغین کی کثیر نفری کی تیاری کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور اگر صوفیوں کے بھیس میں اسماعیلی داعی، ملتان، کرمان، دہلی اور اجمیر کے شہروں میں نہ پہنچتے تو اسماعیلی اسلام کو اعتبار ملتا اور نہ ہی جمہور مسلمانوں کے حلقوں میں آل بیت کے حوالے سے پنجتن کو غیر معمولی تقدس کا حامل سمجھا جاتا۔ اور اگر عباسیوں کی خلافت قائم نہ ہوئی ہوتی تو آل عباس کی مدح سے ہمارے جمعہ کے خطبے خالی ہوتے۔ گویا دین کی ان مختلف تعبیرات کے پیچھے ان سیاسی حوادث کی کارفرمائی ہے جس نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے دین کو بڑی شقی القلبی کے ساتھ استعمال کیا۔ گو کہ یہ ریاستیں اپنی باہمی چپقلش کے نتیجہ میں دیر یا سویر تاریخ کے پردے میں غائب ہو گئیں، ان کی پیدا کردہ فتنہ سامانیاں اور گروہ بندیاں آج بھی ہمارے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی ہیں۔ ایک نئی ابتداء کے لیے لازم ہے کہ ہم تاریخ کو تاریخ کی حیثیت سے پڑھیں، اسے دین نہ سمجھیں۔ اول الذکر رویہ ہمیں تاریخ سے عبرت اور نصیحت پر مہمیز کرتا ہے جب کہ آخر الذکر پر گامزن ہو کر ہم خود ہی باعث عبرت بن جاتے ہیں۔

بعض کلیدی انحرافات پر ایک نظر

خلافت یا امامت

شیعہ اور سنی ان دو فرقوں کو جو چیز ایک دوسرے سے الگ کر دیتی ہے وہ امامت یا خلافت کے سلسلہ میں ان کا متحارب نقطۂ نظر ہے۔ اثنا عشری شیعہ بارہ اماموں کو من جانب اللہ مامور و منصوص گردانتے ہیں، اسماعیلی جو ابتداء سات اماموں کے قائل تھے اب زندہ اماموں کے سلسلہ میں یقین رکھتے ہیں۔ سنی حضرات خلفائے اربعہ کو عقیدے کا حصہ سمجھتے ہیں البتہ عملی طور پر چار ائمۂ فقہ نے ان کی مذہبی زندگی کی کمان صدیوں سے سنبھال رکھی ہے۔ اب اگر کھلے دل ودماغ سے ان تمام نقاطِ نظر کا جائزہ لیجئے تو تھوڑی سی کرید سے پتہ چلتا ہے کہ ان تمام عقائد کا دین سے کچھ بھی علاقہ نہیں۔ یہ تو تاریخ کی مختلف تعبیرات ہیں جو دین اسلام کی تکمیل کے بعد تاریخ کے مختلف ادوار میں مدون ہوئیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ انھیں عقیدے کا سا تقدس اور اعتبار عطا کر دیا جائے۔ خلفائے اربعہ کا مروجہ سنی تصور عباسی خلیفہ متوکل کے عہد میں تشکیل پایا۔ اس سے پہلے یہ تصور عام تھا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ساتھ ہی مسلمانوں کی متفقہ سیاست کا خاتمہ ہوگیا۔ حضرت علیؓ کا ساڑھے چار سالہ عہد باہمی خانہ جنگیوں سے عبارت رہا۔ بلادِ شام کا بڑا حصہ ان کی خلافت کا انکاری رہا اور ان کے عہد میں مسلمان ایک خلافت پر مجتمع نہ ہو سکے۔ اسی سبب عہدِ معاویہ میں تین خلفاء کے تذکرے پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا۔ البتہ عہدِ عباسی میں اجتماعی مصالح کے پیش نظر امام احمد ابن

حنبل نے حضرت علیؓ کو چوتھے خلیفہ رَاشد کی حیثیت سے سنی سیاسی موقف کا حصہ بنالیا۔ بہر حال ان کے عہد تک اس موقف کا اظہار تاریخ کو ایک نئے انداز سے پڑھنے کی کوشش تھی اور بس۔ حضرت علیؓ کی شخصی جلالت اور ان کی عظیم الشان خدمات کے پیش نظر اس موقف کو بہت جلد قبولیت عامہ مل گیا۔ آل عباس کے سیاسی استحکام کے لیے بھی یہ بات مناسب تھی کہ وہ مسلمانوں کے تمام ہی گروہوں کو ساتھ لے کر چلنے کا ظرف رکھتے ہوں، سو ائمہ اربعہ کے ساتھ ساتھ اہل بیت کی فضیلت کا اظہار بھی جمعہ کے خطبوں کا حصہ بن گیا اور بہت جلد مساجد کے منبروں سے اللھم اغفر للعباس اور وجعل خلافة فیھم جیسی دعاؤں کے ساتھ سید اشباب اھل الجنۃ اور سیدۃ النساء فاطمۃ کی صداؤں سے مسجدوں کے منبر گونجنے لگے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک مشترکہ اسلام کی تعمیر اور صلح جوئی کے اس رویہ نے عباسی خلافت کو جمہور مسلمانوں میں اعتبار بخشنے میں نہایت اہم رول انجام دیا البتہ یہ سیاسی اقدامات چونکہ دین کے قالب میں کیے جا رہے تھے اور اگلوں نے اسے دین کی تعبیر کے طور پر دیکھا اس لیے انھیں آگے چل کر سنی عقیدے کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ دوسری طرف بارہ اماموں کا یہ تصور جس پر آج شیعہ اسلام کی عمارت قائم ہے تو واقعہ یہ ہے کہ ان اماموں کے سلسلے سے خود اہل بیت کے اکابرین واقف نہ تھے۔ آج جن بارہ اماموں کی ترتیب وار فہرست سے واقفیت کو شیعہ علماء عقیدے کا حصہ جانتے ہیں، کوئی ایسی فہرست یقیناً جعفر صادق کے عہد میں نہیں پائی جاتی تھی۔ زید بن علی نے جب خروج کیا تھا تو انھیں اپنے بھائی محمد الباقر کی حمایت اور معیت حاصل نہ تھی۔ اگر اس

عہد میں اہل تشیع اس بات پر مطلع ہوتے کہ محمد الباقر امام منصوص ہیں تو زید کو اس بات کی خبر کیونکر نہ ہوتی اور پھر ان کے لیے یہ کیونکر ممکن ہوتا کہ وہ امام وقت کی رضامندی کے بغیر اپنے طور پر اقدامی عمل کا آغاز کر دیں۔ محمد ابن حنفیہ جو حضرت علیؓ کی غیر فاطمی اولاد ہیں اور جن کی انقلابی سرگرمیاں اور ان کی باقیات بہت بعد تک امویوں کے لیے دردِ سر بنی رہیں، وہ بھی منصوص امامت کے حَسنی حُسینی سلسلے سے واقف نہ تھے، ورنہ انھیں اپنے طور پر انقلابی اقدامات کی ضرورت کیوں پیش آتی؟ اموی اور عباسی عہد میں حلقۂ آل بیت کے مختلف حلقوں سے امام حسین کے علاوہ کوئی ساٹھ چھوٹے بڑے خروج عمل میں آئے۔ اگر ائمہ منصوص کے اس الہامی سلسلے سے اہل بیت کی واقفیت ہوتی تو یقیناً وہ ان ائمہ کی موجودگی میں اپنے طور پر خروج کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ گویا جس فہرست سے آشنائی کو آج ہم دین وایمان کا مسئلہ سمجھے بیٹھے ہیں اس سے ابتدائی عہد کے اہل بیت کے حلقے واقف نہ تھے، پھر اسے دین کی اساس قرار دینے کا آخر کیا جواز ہے؟ امامت کے اس آسمانی سلسلہ پر خود شیعان اہل بیت کے مختلف حلقوں میں تاریخ کے ہر دور میں اختلاف پایا جاتا تھا اور آج بھی اسماعیلی، اثناعشری، اور اہل تشیع کے دوسرے گروہوں کا علیحدہ وجود اسی سبب قائم ہے۔ فکر ونظر کا یہ سارا افتراق وانتشار خواہ وہ سنیوں میں ہو یا شیعوں میں، دراصل تاریخ کو عقیدے کے طور پر پڑھنے کے سبب ہے۔ ذرا غور کیجیے! حضرت علی جب خلیفۂ مقتدر تھے، جب عالم اسلام کے ایک بڑے حصہ پر ان کی حکمرانی قائم تھی، کیا ان کے عہد میں شیعوں کی اذانیں الگ تھیں، یا وہ سہم امام کے نام پر اپنے متبعین سے

خمس کی رقم وصول کیا کرتے تھے؟ اگر ایسا نہیں تھا تو آج ان کے نام لیوا ایک نئی اذان اور نئی دینی شناخت کے قیام پر کیوں مصر ہیں؟ کیا اس طرح وہ اپنے امام عالی مقام کی تردید وتکذیب نہیں کر رہے ہیں؟ کچھ یہی حال اہل سنت والجماعت کے علمبرداروں کا بھی ہے جنھوں نے ائمہ اربعہ کے تاریخی بیان کو عقیدے کا سا تقدس بخش رکھا ہے، اور جس کے تنقیدی محاکمے سے انھیں سنّی اسلام کی دیواریں منہدم ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ خلفائے اربعہ تو خیر سے صرف ایک منجمد عقیدے کا اظہار ہے عملی طور پر ان کی مذہبی زندگی جن ائمہ اربعہ کی زیرنگرانی جاری وساری ہے ان کی حقیقت بس اتنی ہے کہ یہ حضرات اپنے وقت کے دوسرے بہت سے اصحاب فن کی طرح کلامی فقہ میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ اوزاعی، سفیان ثوری، لیث بن سعد، سفیان بن عیینہ، ابن راہویہ، داؤد ظاہری، جریر طبری اور ان جیسے دیگر بہت سے علماء کی طرح اپنے اپنے عہد میں ان چار سنّی اماموں کی مسند ارشاد بھی قائم تھی۔ امام مالک کو اولاً خلیفہ منصور کی تادیب اور پھر اس کی حمایت حاصل ہوگئی جس کے سبب مؤطا سرکاری فقہ، یوں سمجھیے، بس بنتے بنتے رہ گئی۔ اسی عہد کے لیث بن سعد اپنی تمام تر جلالت علمی کے باوجود محض اپنے غیر مصالحانہ رویہ کے سبب سماجی منظرنامے پر ٹھٹھر کر رہ گئے۔ حتیٰ کہ آنے والے دنوں میں ایک مدرسۂ فکر کی حیثیت سے ان کا تفصیلی تذکرہ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ حنفی فقہ قاضی ابو یوسف کے سہارے مملکت کی سرپرستی سے سرفراز ہوئی اور متوکل کے عہد میں ابن حنبل کو مذہبی مشیر کی حیثیت حاصل ہوجانے کے سبب ان کے تفقہ کا شہرہ ہوگیا ورنہ خود ان کے عہد میں، بلکہ بہت

بعد تک، اہل فن ابن حنبل کو محض محدث جانتے، فقیہہ کی حیثیت دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ مصر روایتی طور پر شافعی کے شاگردوں کا گڑھ تھا لیکن ممالیک کے عہد میں سیاسی مصالح کے سبب جب شافعی قاضی کا زور توڑنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو سیاسی قیادت نے متبادل قضاۃ کے قیام کی ضرورت محسوس کی۔ بیبرس جسے عین جالوت پر منگولوں کے طوفانِ بلاخیز کو روک دینے کے سبب غیر معمولی توقیر حاصل ہوگئی تھی، اس نے متبادل اور متحارب فقہاء کے مابین مصالحت کی خاطر چار الگ الگ مسالک کے قضاۃ متعین کر دیے۔ کسے پتہ تھا کہ دین اور مصالح دین سے بے خبر ایک فوجی حکمراں کا یہ وقتی فیصلہ آنے والے دنوں میں دوام اور تقدس اختیار کر جائے گا، اور مسلمان ان ہی چار ائمہ میں سے کسی ایک کی اتباع کو اپنے لیے لازم کر لیں گے۔ اگر بیبرس نے ان چار مسالک کے الگ الگ قضاۃ متعین نہ کیے ہوتے تو یہ ائمہ اربعہ بھی درجنوں دوسرے کبار فقہاء کی طرح ہماری دانشورانہ تاریخ کا حصہ ہوتے اور بس۔ انھیں سنی اسلام کے اساطین کی حیثیت حاصل نہ ہوتی۔

مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ اگر سیاسی اختلاف کے سبب مسلمانوں میں متبادل خلافتوں کا ظہور نہ ہوا ہوتا، اگر اندلس کے اموی، قاہرہ کے فاطمی اور بغداد کے عباسی خلفاء نے اپنے الگ الگ سیاسی قلعے تعمیر نہ کیے ہوتے اور اگر اپنی سیاست کو جواز بخشنے کے لیے ان حضرات نے دین کا سہارا نہ لیا ہوتا تو دین کے یہ مختلف قالب اپنی علیحدہ شناخت کے ساتھ ہرگز وجود میں نہ آتے۔

الہامی دین: انسانی حوالے

کبھی آپ نے غور کیا دین اسلام جو منزل من اللہ ہے، اور جس کے اتمام کا کام آپ کی عین حیات مبارکہ میں ہو چکا تھا جیسا کہ آیت قرآنی الیوم اکملت لکم دینکم سے ظاہر ہے تو پھر اس آسمانی دین میں انسانی حوالوں کا آخر کیا جواز ہے؟ قرآن مجید اپنی صداقت کے لیے یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا یعنی یہ کہ اگر تم قرآن مجید کی تعلیمات میں باہم تعارض نہیں پاتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ من جانب اللہ ہے ورنہ اگر یہ انسانوں کا تعمیر کردہ دین ہوتا تو اس میں اختلافِ فکر ونظر کی جابجا کارفرمائیاں ہوتیں۔ دینِ اسلام میں آج اتنے مختلف قالب کے ظہور کی وجہ بھی دراصل یہی ہے کہ ان کی تشکیل وتعمیر میں وحی ربانی سے کہیں زیادہ انسانی تشریحات وتعبیرات کا دخل ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک الہامی دین، جس کا غیر محرف آسمانی وثیقہ قرآن مجید کی شکل میں آج بھی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے، اسی دین کے حاملین اپنے لیے حنفی، شافعی، زیدی، جعفری، سلفی، اسماعیلی جیسی نسبتوں کو کیونکر انگیز کیے لیتے ہیں؟ آخر یہ کیسے ہوا کہ ابوالحسن اشعری کو یہ اختیار مل گیا کہ وہ سنی اسلام کے شارح اور ترجمان بن جائیں اور ان کا تشکیل کردہ محضر نامۂ عقائد اگلی نسلوں کے لیے ایک ناگریز حوالہ بن جائے۔ اشعری ہوں یا ماتریدی، واصل بن عطا ہوں یا خلیفہ مامون اور ابن حنبلؒ، عقائد کی بحث میں ان سبھوں نے ان حدود سے تجاوز کیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن

مجید میں واشگاف الفاظ میں متعین کر دیا تھا: کل آمن باللہ و ملکتہ و کتبہ ورسلہ لا نفرق بین أحد من رسلہ۔ عقائد کے اس تفصیلی بیان کے بعد اس بات کی گنجائش ہی کب تھی کہ مسئلہ جبر وقدر یا قرآن کے حادث وقدیم ہونے یا خدا کی ذات وصفات سے متعلق مختلف امور کو عقائد کا مسئلہ بنایا جاتا، یا حضرت علی کے خلیفۂ بلافصل یا خلیفہ رابع ہونے کی بات فہم تاریخ کے بجائے عقیدے کی حیثیت اختیار کر لیتی۔ اللہ نے ایک دین بنایا اور اپنی کتاب میں حلال وحرام اور ترغیب واجتناب کی حدود تمام تفصیلات کے ساتھ کھول کھول کر بیان کر دیا۔ پھر اس کے بعد اس بات کی گنجائش کب تھی کہ جو چیز ایک فقیہہ کے ہاں مکروہ وممنوع ہو وہ دوسرے کے ہاں جائز اور مباح قرار پائے۔ غایت وحی تک رسائی میں انسانی فہم کا اختلاف تو یقیناً ہوسکتا ہے لیکن ناقص انسانی فہم کو دینی ماخذ کی حیثیت حاصل ہو جائے اس ستم ظریفی کا آخر کیا جواز ہے؟ اصولی طور پر تو ہم آج بھی اس بات کے قائل ہیں کہ پچھلے بھی ہماری طرح انسان تھے جن سے خطاو صواب دونوں کے صدور کا امکان تھا لیکن ھم رجال و نحن رجال کہنے کے باوجود اہل تشیع جس طرح کلینی، شیخ مفید، شریف رضی و مرتضیٰ اور شیخ الطائفہ طوسی کے دواوین کو پس پشت نہیں ڈال سکتے، اسی طرح اہل سنت بھی اپنے اندر یہ جرأت نہیں پاتے کہ وہ ائمہ اربعہ سے ماوراء دین مبین کے اصل پیمبرانہ خدوخال کو از سرِ نو متصور کر سکیں۔ حتیٰ کہ جن لوگوں کو ترک تقلید کا دعویٰ ہے اور جو راست کتاب وسنت سے اکتساب کی بات کرتے ہیں، وہ بھی سلف صالحین کی اتباع سے آگے نہیں پہنچتے۔ اب انھیں یہ کون سمجھائے کہ آج ہم جنھیں سلف صالحین

قرار دیے بیٹھے ہیں انھیں اپنے زمانے میں یہ تقدس اور یہ اعتبار حاصل نہ تھا۔ معاصرین سے باقاعدہ ان کی چشمک رہتی۔ اگر اہل علم کا ایک حلقہ ان کے مداحوں اور شاگردوں پر مشتمل ہوتا تو دوسرا حلقہ ان کی تردید و تکذیب بلکہ بسا اوقات ان کی تکفیر سے بھی باز نہیں آتا۔ خطیب بغدادی نے کبار فقہاء اور ان کے شاگردوں کی ایک دوسرے کے بارے میں لاف زنی کو ہماری عبرت کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ بخاری اور مسلم جن کے مجموعوں کو آج قرآن کی سی تقدیس حاصل ہے اور جنھیں بعض لوگ اصح کتاب بعد کتاب اللہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے، یہ حضرات بھی اپنے زمانے میں غیر متنازع نہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسماعیل بخاری اور محمد بن یحییٰ ذہلی کی باہمی چشمک جب شدت اختیار کر گئی تو امام مسلم کے لیے یہ فیصلہ کرنا کچھ آسان نہ رہا کہ وہ اپنے ان دو اساتذہ میں سے کس کی حمایت کریں۔ مسلم نے بالآخر ذہلی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس مخالفت میں وہ اس حد تک گئے کہ انھوں نے ذہلی سے حاصل کردہ تمام احادیث و آثار کی نقلیں اونٹوں پر لدوا کر انھیں واپس بھجوا دیں۔ اب ذرا غور کیجیے! اگر ان دو شیوخ کا جھگڑا اس شدت کو نہ پہنچا ہوتا تو مسلم کے مجموعۂ احادیث کی شکل آج کتنی مختلف ہوتی۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسانی تالیفات کو جس کی جمع و تدوین اور تحقیق و تجزیے میں انسانی ذہن کی کارفرمائی ہو اسے لازوال دینی ماخذ کی حیثیت عطا کر دی جائے اور وہ بھی اس طرح کہ صحاح ستہ کی بنیاد پر سنی اسلام کا خرمن تشکیل پائے اور کافی، ابن بابویہ، استبصار توسی اور نہج البلاغۃ کی بنیاد پر شیعہ اسلام کی عمارت قائم ہو۔

احبارِ اسلام کا ظہور

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جب قرآن مجید ہمارے فکر وعمل کا واحد حوالہ تھا کسی کو یہ خیال بھی نہ آتا کہ وہ کسی مسئلہ پر کبار شیوخ سے رہنمائی کا طالب ہوتا۔ حضرت عمرؓ کے فہم قرآن پر ایک بادیہ نشیں عورت برسرِ عام شبہات وارد کرتی، عمرؓ کو اپنی غلطی کا احساس ہوجاتا اور وہ برسرِ منبر اپنے موقف سے رجوع کر لیتے جیسا کہ مہر کے مسئلہ پر تاریخ وآثار کی کتابوں میں تفصیلات مذکور ہیں۔ مانعینِ زکوٰۃ کے سلسلے میں ابوبکر صدیقؓ کا سخت گیر موقف باہمی اتفاق رائے کے فقدان کے سبب تعطل کا شکار رہا یہاں تک کہ اسیران رِدّہ کو حضرت عمرؓ کے زمانے میں رہائی مل گئی۔ جب ابوبکرؓ اور عمرؓ جیسے کبار صحابہ کے فہم واستنباط کو فتویٰ کی حیثیت حاصل نہ تھی، اور اسے عام مسلمان قرآن کی کسوٹی پر چیلنج کرنا اپنا حق سمجھتے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآنِ مجید کو امت کی فکری زندگی میں کس قدر مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ مسلمانوں کی پہلی نسل اس حقیقت کا بھرپور ادراک رکھتی تھی کہ اسلام نے بندے کو خدا سے براہِ راست مربوط کردیا ہے۔ اب خدا اور بندے کے مابین کسی پاپائیت یا مشائخیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن مجید نے واشگاف الفاظ میں محمد رسول اللہ کو ایک ایسے نبی کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا جو لوگوں کی گردنوں کو مذہبی رسوم وقیود اوران علائق سے آزاد کرتا ہے جس میں خانہ ساز مذہبیت نے انھیں جکڑ رکھا تھا: ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم۔ لیکن بدقسمتی سے آنے والی صدیوں میں اسلام کا یہ امتیازی وصف جاتا رہا۔ اس کی ابتداء گو کہ شافعی کے الرسالة سے ہوگئی تھی البتہ اسلامی مولوی کی

صورت گری پوری طرح عہد فاطمیین میں منتج ہوئی جب دین کی سیاسی تعبیر نے شرعی علوم کا درجہ حاصل کرلیا اور دارالعلم سے الگ نظامیہ مدارس کے سلسلوں، صوفیاء کی خانقاہوں اور تکیوں میں روحانی اور دینی علوم کی گرم بازاری ہوگئی۔ قرآنِ مجید علومِ شرعیہ کی اصطلاح سے یکسر خالی ہے۔ یہاں تو ہمیں یہ بتا یا گیا ہے کہ حرام وحلال کا فیصلہ کرنا صرف اور صرف خدائے بزرگ و برتر کا کام ہے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ کی حیثیت بھی شارع کی نہیں بلکہ شارح کی ہے جیسا کہ آپؐ سے منقول ہے: انی لا احل الا ما احل الله فی کتابه، ولا احرم الا ما حرم الله فی کتابه۔

قرآن مجید واشگاف الفاظ میں فتویٰ کا حق خدا کے لیے مخصوص کرتا ہے جیسا کہ یستفتونك فی النساء قل الله یفتیکم جیسی آیت سے ظاہر ہے یعنی یہ کہ وہ تم سے عورتوں کے سلسلے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں کہو اس بارے میں اللہ کا فتویٰ موجود ہے۔ اتنی مبیّن تصریحات کے بعد کوئی نظری گنجائش تو نہ تھی کہ ہمارے ہاں بھی پنڈت، پادری اور ربائی کی طرح مولویوں اور مشائخ کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آجائے جسے اس بات کا دعویٰ ہو کہ وہ علومِ شرعی کا شناور اور فتویٰ دینے کا اہل ہے۔ لیکن افسوس کہ اضمحلالِ خلافت کے ایام میں جب عباسی خلفاء قابضین اور غاصبین کو امیر الامرائی اور سلطانی عطا کرنے پر مجبور تھے انھوں نے سماجی منظرنامے پر ورع وتقویٰ اور علم دین کے حوالے سے بعض فقہا و محدثین کو منصب مشائخیت پر متمکن کردیا۔ علماء وصوفیاء کے پاس عوامی مقبولیت تھی اور سلطانی کے خواہش مند سلاجقہ کے ہاتھوں میں تلوار کی قوت تھی۔ مضمحل خلافت

نے اپنی بقا کے لیے ان دونوں گروہوں سے سمجھوتہ کرنے میں ہی عافیت جانی اور اس طرح خلافت جو کبھی بیک وقت دینی اور سیاسی قیادت کا امتزاج ہوا کرتی تھی خانوں میں بٹ کر رہ گئی۔ اس وقتی مصلحت پسندی سے ایک بڑا اور ناقابل تلافی نقصان یہ ہوا کہ خلیفہ کی ذات ایک مؤثر قیادت کے بجائے سلاطین اور علماء کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئی۔ سلاطین چونکہ تلوار کے سہارے برسرِ اقتدار آئے تھے اس لئے ان کی شناعت ہر کس و ناکس پر عیاں تھی البتہ علماء نے ورع و تقویٰ کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اس لیے ان کے اصل ارادوں پر پردہ پڑا رہا۔ گذرتے وقتوں کے ساتھ انھیں دین اسلام کے مستند شارحین کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ ان کے اقوال اور نظائر تقدس کے حامل سمجھے جانے لگے۔ حالانکہ جب وحی ربانی سے مسلمانوں کا تعلق راست قائم تھا پچھلوں کے نظائر ہمارے پیروں کی بیڑیاں نہیں بن پائے تھے۔ اب اس سے بڑی تاریخی شہادت اور کیا ہوگی کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں خود رسول اللہ کے نظائر کو بدل ڈالنے میں کسی تکلف کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ مثلاً خراجی زمینوں کی تقسیم یا مؤلفۃ القلوب کے سلسلہ میں انھوں نے رسول اللہ کی سنت یا نظائر سے مختلف موقف اختیار کیا۔

تب وحی ربانی کی حیثیت ہمارے لیے ایک ایسے نشانِ راہ کی تھی جو ہمیں شاہراہِ ہدایت پر ہر لحہ گامزن رکھتی تھی۔ کہاں نبی مرسل کے نظائر کا خلاقانہ جائزہ اور کہاں شافعی اور ابو یوسف کے اقوال سے دلیل لانے کی کورانہ تقلید۔ کہاں حالات و ظروف کی تبدیلی کے سبب نظائرِ رسول بدل ڈالنے کی ضرورت کا

احساس اور کہاں شامی اور الکاسانی کی تحریروں میں غایتِ شرع کی تلاش کی مذموم کوشش۔ سلاطین سلاجقہ جنھوں نے بزور بازو اسلام کے سیاسی نظام میں اپنے لیے گنجائش پیدا کی تھی، آنے والے دنوں میں تاریخ کا حصہ بن گئے۔ مضمحل عباسی خلافت بھی منگولوں کے ہاتھوں اختتام کو پہنچی۔ البتہ مشائخیت نے علمائے شرع، متصوفین، روحانی خلفاء، نسلی سیادت جیسے مختلف ناموں سے اسلام کے نظری مرکز میں کچھ اس طرح اپنی جگہ بنائی کہ تجدید واحیاء کی ہزار کوششوں کے باوجود آج تک اس اجنبی ادارے کی بساط لپیٹی نہیں جاسکی۔ یہ خیال عام ہوا کہ دین کی تشریح وتعبیر کا تمام تر حق اب علمائے اسلام کو حاصل ہے جن کی حیثیت وارثینِ علومِ نبوت کی ہے اور جن کا مقام انبیاء بنی اسرائیل سے کچھ کم نہیں۔ یہ کچھ وہی صورتِ حال تھی جب ربائی اکیوا نے توراۃ کے مفاہیم پر تلمودی شارحین کا حق بتایا تھا اور جب انھوں نے اس خیال کا برملا اظہار کیا تھا کہ خدا نے جب ایک بار توراۃ ہمارے حوالے کردی ہے تو اب اس کے مفاہیم کا تعین ہماری صوابدید پر ہے۔ دین اسلام میں اس نئی مشائخیت کے ظہور سے وحی ربانی کے گرد انسانی تشریحات وتعبیرات کا ایک حصار قائم ہوگیا۔ عام انسانوں پر قرآنِ مجید کے صفحات بند ہوگئے۔ چونکہ اب ان علماء نے اجتہاد وتفقہ کا حق بھی اپنے لیے محفوظ کرلیا تھا جس کے لیے آخری حوالہ سلفِ صالحین کے منجمد اقوال تھے، وحی کا لازوال وثیقہ نہ تھا سو ان کی تمام تر کوشش رہی کہ کتاب ہدایت دوبارہ کھلنے نہ پائے۔ کہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اندیشہ ہی نہیں بلکہ اس بات کا عین امکان تھا کہ تاریخی اسلام کی عمارت ہل جاتی، متقدمین کی ثقاہت اور جلالت علمی شک کے

دائرے میں آجاتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علمائے شرع متین کی موجودہ مرکزی حیثیت ہی زمیں بوس ہو جاتی۔ وہ جس شاخ پر بیٹھے تھے اسے اپنے ہی ہاتھوں سے کیسے کاٹ سکتے تھے؟

گذشتہ چند صدیوں سے تجدید واحیاء کی جتنی کوششیں ہوئی ہیں ان کی حیثیت دراصل منحرف اور تراشیدہ تاریخی اسلام کو ہی رنگ وروغن فراہم کرنے کی ہے۔ ائمہ اربعہ کی اختلافی فقہ میں وسیع النظری سے کام لینے کا مشورہ ہو یا شیعہ سنی خلیج کو پاٹنے کی باتیں، یا اقوال بزرگاں کی فقہی سختیوں بلکہ تعذیب سے نکلنے کے لیے نئے فقہی حیلے کی دریافت کا مژدہ، ہم سو بہانے سے اپنے انحراف پر پردہ ڈالتے رہے ہیں۔ کسی کو اس بات کی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ ببانگ دہل ان فکری انحرافات اور تراشیدہ التباسات کو خیر باد کہنے کی دعوت دے، جو اس بات کی نشاندہی کرے کہ تم علوم القرآن کے نام پر مختلف قسم کی اختلافی قراٴتوں، ناسخ ومنسوخ کی لاطائل بحثوں، شانِ نزول کی متضاد روایتوں، سبعہ احرف کی ناقابل فہم باتوں، فضائل وقوارع کی بے اصل حکایتوں اور وفق ونقوش کے مکروہ کاروبار کو عرصہ ہائے دراز سے اپنی درسگاہوں میں پڑھا رہے ہو یہ سب تمہارے تراشیدہ علوم ہیں، یہ وہ بحثیں ہیں جو بعد کے لوگوں نے ایجاد کیں، جن سے یقیناً مسلمانوں کی پہلی نسل واقف نہیں تھی۔

مسلمانوں کی فکری تاریخ کا یہ کتنا بڑا طنز ہے کہ جب وحی ربانی سے ہم ایک خلاقانہ رشتہ میں مربوط تھے، جب زندگی کے ہر موڑ پر یہ کتاب ہماری رہنمائی کرتی اور اپنے موقف کی حمایت میں متبعین محمدؐ نص قرآنی کو پیش کرنا کافی

سمجھتے تھے۔ اس وقت تک مسلمانوں میں منصب کا تصور قائم نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کسی کے حاشیہ خیال میں یہ بات آئی تھی کہ وہ فرض، واجب، سنت، نوافل، مکروہ، مباح جیسی کلامی زدہ اصطلاحوں کے مطالب شرعی کے لیے استعمال کرتے۔ تب ہمارے ہاں اہل یہود کے [illegible] آئے تھے۔ شیخ الحدیث، حجۃ الاسلام جیسی کوئی مخلوق وجود میں نہیں آئی تھی جو [illegible] کے خلاف میں بیانات [illegible] شرع شریعت اپنے سینوں میں [illegible] کے ذریعے یتیموں کے مال پر ہاتھ صاف کرنے کا [illegible]۔ تب نہ تو ہمارے درمیان کوئی حضرت مولانا، علامہ اور نہ ہی کوئی شیخ الاسلام یا حجۃ الاسلام جیسے مقدس خطابات کا [illegible] سمجھا جاتا۔ نہ کوئی فضیلۃ الشیخ تھا اور نہ سماحۃ الشیخ، نہ کوئی دامت برکاتہم تھا اور نہ ہی کوئی نرا مولوی۔ سچ تو یہ ہے کہ شافعی کے رسالہ سے شروع ہونے والا یہ سفر، جو بالآخر تقسیم خلافت اور اس کے اضمحلال کے نتیجے میں علمائے اسلام کے ادارے کی شکل میں منتج ہوا، دین اسلام میں اتنی بڑی بدعت تھی جس نے اسلام جیسے حیات افزا دین کو ایک منجمد اور بے روح مذہب میں تبدیل کر دیا۔ اگر فکری اور علمی تاریخ پر ہماری نگاہ ہو اور ہم تقسیم خلافت، اس کے اضمحلال اور اس دوران پیدا ہونے والے فکری التباسات کو بیک نظر متصور کر سکیں تو ہمارے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ آنے والے دنوں میں اسلام کے متحدہ قالب کی تشکیل کے لیے کوئی کوشش اس وقت تک بامراد نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم علومِ شرعی کے مروجہ تصور کا قرآن مجید کی روشنی میں از سرِ نو محاکمے کا یارانہ رکھتے ہوں۔ اب تک شرعی علوم کے تراشیدہ اور مسخ شدہ پیمانوں سے غایتِ قرآنی کی تفہیم و تعبیر کا کام لیا جاتا رہا

ہے۔ ایک نئی ابتداء کے لیے لازم ہے کہ مناقشہ اور محاکمہ کی کمان اب پوری طرح قرآن کے ہاتھوں میں سونپ دی جائے۔

یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں ابتدائے عہد سے اصول دین اور اصول فقہ کی تدوین میں منہج کلامی کو کچھ اس طرح در آنے کا موقع ملا کہ مناقشہ اور مجادلہ کے اس ماحول میں ہمارے کبار مفکرین کو بھی اس کی مضرت رسانیوں کا اندازہ نہ ہوسکا۔ عبدالرحمان المہدی کی ایما پر، جو یہ چاہتے تھے کہ استنباط شرع کے علمی اور معروضی اصول منضبط ہو جائیں، شافعی نے الرسالہ کی تصنیف کا بیڑا اٹھایا۔ بدقسمتی سے آنے والے دنوں میں منہج الرسالہ کی تراش وخراش اور اس کے تنقیدی محاکمہ کے بجائے اگلی کتابیں اس کے توسیعہ کے طور پر لکھی جاتی رہیں۔ اس طرح الرسالہ کو محض ایک علمی کوشش کے بجائے رفتہ رفتہ تقدیسی حیثیت حاصل ہوگئی۔ بلکہ یہ کہہ لیجئے کہ آنے والے دنوں میں فقہ کے نمو وارتقاء کی کمان بڑی حد تک صاحب الرسالہ کے ہاتھوں میں ہی رہی۔ اب ذرا اس بات کو یوں سمجھیے؛ واصل بن عطا جو اپنے عہد میں اپنے معتزلی رجحانات کے سبب ناقابل اعتناء سمجھے جاتے تھے انھوں نے تلاش حق کی بنیاد چار باتوں پر رکھی تھی۔ اولاً، یہ دیکھا جائے کہ اس بارے میں قرآن کیا کہتا ہے۔ ثانیاً، پھر سنت میں اس کے نظائر تلاش کیے جائیں۔ تیسرے مرحلے میں اجماع کو قابل اعتناء سمجھا جائے اور اگر ان تینوں سے کوئی واضح رہنمائی نہ ملتی ہو تو قیاس بمعنی اجتہاد سے مدد لی جائے۔ آگے چل کر واصل کا یہ اصول اربعہ ایک عظیم الشان منہج کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ حتی کہ ان چار اصولوں کو ماخذ شرع کی

حیثیت حاصل ہوگئی۔ واصل شاید اس بات کے لیے متہم نہیں کیے جاسکتے کہ انھوں نے قرآن مجید جیسے لازوال ماخذ کو تین دوسرے ظنی ماخذ کی سطح پر لا اتارا ہے۔ لیکن آگے چل کر عملاً ہوا یہی کہ ان میں سے ہر ایک ماخذ نے فی نفسہ اپنی جگہ ایک مستقل ستون کی حیثیت اختیار کرلی۔ بعض مفسرین اجماع کی توقیر میں اضافے کی خاطر یہاں تک کہنے لگے کہ قرآن مجید کی صحت وعصمت اجماع کے دم سے ہی قائم ہے کہ عبداللہ بن مسعود معوذتین کو قرآن مجید کی سورتوں میں شمار نہیں کرتے تھے لیکن اجماع کے سبب انھوں نے اپنے اس موقف پر خاموشی اختیار کر لی۔ سو اس نقطۂ نظر کے مطابق آج قرآن مجید میں ان دو سورتوں کی موجودگی اجماع ہی کے سبب ہے۔ حالانکہ ان روایتوں کی ذرا سی کرید سے ان کی اصلیت واشگاف ہوسکتی ہے۔ لیکن فقہ کے ان اصولِ اربعہ کی ہیبت ہمارے شارحین پر کچھ اس قدر ہے کہ اس کی حمایت میں عصمت قرآن کا دامن بھی ان کے ہاتھوں سے بسا اوقات چھوٹ جاتا ہے۔ یہ بات بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو کہ شافعی کے عہد سے آج تک اس بات کا تعین نہیں ہوسکا ہے آیا اجماع سے مراد صرف اہل علم کا اجماع ہے یا عوام بھی اس میں شامل ہیں؟ پھر اجماع کسی ایک شہر کے علماء وعوام کا اجماع ہے یا اس سے مراد تمام ہی بلاد وامصار ہیں؟ ایک شہر کا اجماع دوسرے شہر کے لیے حجت ہوسکتا ہے اور یہ کہ ایک عہد کا اجماع دوسرے عہد کے لیے لائق اعتناء سمجھا جائے گا یا نہیں؟ ان امور پر ابھی کوئی فیصلہ کن بات ہونا باقی ہے۔ بلکہ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ کسی مسئلہ پر علماء وفقہاء کے مابین کبھی کوئی اجماع ہوا بھی ہے یا نہیں۔ جب پانچ وقت کی اجتماعی عبادت

کا یہ حال ہے کہ ابو حنیفہ کے ہاں فرض نماز کی پہلی رکعت میں قرأت فرض ہے جبکہ شافعی کے نزدیک تمام رکعات میں، مالک کے نزدیک پہلی تین رکعتوں میں اور حسن بصری کے نزدیک صرف پہلی رکعت میں ایسا کرنا واجب ہے۔ جب فرض نماز پر آج تک اجماع نہ ہو سکا ہو تو دوسرے امور پر اجماع کا دعویٰ کہاں تک برحق ہے اس کا اندازہ اہل نظر خود کر سکتے ہیں۔

تعبیر و تفقہ کے اس منہج کو اگر محض ایک علمی معرکہ آرائی کی حیثیت حاصل ہوتی تو اس کی تراش و خراش بلکہ تطہیر و اصلاح کے امکانات بھی برقرار رہتے لیکن بدقسمتی سے ہوا یہ کہ انھیں اصولِ فقہ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اب ہر ایک کے لیے یہ لازم سمجھا جانے لگا کہ وہ مسئلہ مذکور پر نص قرآنی کے علاوہ یہ بھی دیکھے کہ اس بارے میں اجماع و آثار کیا کہتے ہیں۔ ظاہری اور شیعہ علماء نے اگر قیاس کو مسترد بھی کیا تو انھوں نے دوسرے ناموں سے ایک زندہ مجتہد کی گنجائش پیدا کر لی۔ کچھ یہی حال استحسان اور مصالح مرسلہ کی اصطلاحوں کا بھی ہے جو دراصل قیاس واجتہاد کا ہی توسیعہ ہیں۔ غایت وحی کی تلاش کے اس پیچیدہ عمل نے صرف عام لوگوں پر ہی نہیں، بلکہ علماء و خواص پر بھی وحی ربانی کے دروازے بند کر دیے۔

روحانی خلافت یا پیری مریدی

وحی ربانی کے گرد فقہاء کے قائم کردہ حصار سے امت کی راہ گم ہوگئی۔ مسلمانوں کی ملی اور مذہبی زندگی اپنے ہی جیسے انسانوں کی متضاد اور متحارب آراء کے گرد گردش کرنے لگی۔ اب کسی کو اس بات سے کوئی سروکار نہ رہا کہ کسی مسئلہ پر خدا کی کتاب کیا کہتی ہے، بلکہ اہمیت اس بات کو حاصل ہوگئی کہ اس بارے میں

سمجھتے اس وقت فقہاء کی مسندیں قائم نہیں ہوئی تھیں اور نہ ہی کسی کے حاشیۂ خیال میں یہ بات آتی تھی کہ وہ فرض وواجب، سنت ونوافل، مکروہ ومباح جیسی کلام زدہ اصطلاحوں کو مطالب شرع کے لیے استعمال کرتا۔ تب ہمارے ہاں اہل یہود کے ربائیوں کی طرح ایسے شقی القلب احبارِ اسلام کی کوئی نسل وجود میں نہیں آئی تھی جو کسی مکروہ عمل کو مکروہِ تنزیہی اور مکروہ تحریمی کے خانوں میں بانٹ کر غایت شرع کو شکست دینے کی بابت سوچتی یا حیلۂ تملیک کے ذریعہ یتیموں کے مال پر ہاتھ صاف کرنے کی ترکیب بتاتی۔ تب نہ تو ہمارے درمیان کوئی حضرت مولانا کہلاتا اور نہ ہی کسی کو شیخ الاسلام یا حجۃ الاسلام جیسے تقدیسی خطابات کا سزاوار سمجھا جاتا۔ نہ کوئی فضیلۃ الشیخ تھا اور نہ سماحۃ الشیخ، نہ کوئی دامت برکاتہم تھا اور نہ ہی کوئی نرا مولوی۔ سچ تو یہ ہے کہ شافعی کے الرسالہ سے شروع ہونے والا یہ سفر، جو بالآخر تقسیم خلافت اور اس کے اضحلال کے جھٹپٹے میں علمائے اسلام کے ادارے کی شکل میں منتج ہوا، دین اسلام میں اتنی بڑی بدعت تھی جس نے اسلام جیسے حیات افزا دین کو ایک منجمد اور بے روح مذہب میں تبدیل کر دیا۔ اگر فکری اور علمی تاریخ پر ہماری نگاہ ہو اور ہم تقسیم خلافت، اس کے اضحلال اور اس دوران پیدا ہونے والے فکری التباسات کو بیک نظر متصور کر سکیں تو ہمارے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ آنے والے دنوں میں اسلام کے متحدہ قالب کی تشکیل کے لیے کوئی کوشش اس وقت تک بامراد نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم علومِ شرعی کے مروجہ تصور کا قرآنِ مجید کی روشنی میں ازسرِ نو محاکمے کا یارانہ رکھتے ہوں۔ اب تک شرعی علوم کے تراشیدہ اور مسخ شدہ پیمانوں سے غایتِ قرآنی کی تفہیم وتعبیر کا کام لیا جاتا رہا

ہے۔ ایک نئی ابتداء کے لیے لازم ہے کہ مناقشہ اور محاکمہ کی کمان اب پوری طرح قرآن کے ہاتھوں میں سونپ دی جائے۔

یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں ابتدائے عہد سے اصول دین اور اصول فقہ کی تدوین میں منہج کلامی کو کچھ اس طرح در آنے کا موقع ملا کہ مناقشہ اور مجادلہ کے اس ماحول میں ہمارے کبار مفکرین کو بھی اس کی مضرت رسانیوں کا اندازہ نہ ہو سکا۔ عبدالرحمان المہدی کی ایما پر، جو یہ چاہتے تھے کہ استنباط شرع کے علمی اور معروضی اصول منضبط ہو جائیں، شافعی نے الرسالہ کی تصنیف کا بیڑا اٹھایا۔ بدقسمتی سے آنے والے دنوں میں منہج الرسالہ کی تراش وخراش اور اس کے تنقیدی محاکمہ کے بجائے اگلی کتابیں اس کے توسیعہ کے طور پر لکھی جاتی رہیں۔ اس طرح الرسالہ کو محض ایک علمی کوشش کے بجائے رفتہ رفتہ تقدیسی حیثیت حاصل ہو گئی۔ بلکہ یہ کہہ لیجئے کہ آنے والے دنوں میں فقہ کے نمو وارتقاء کی کمان بڑی حد تک صاحب الرسالہ کے ہاتھوں میں ہی رہی۔ اب ذرا اس بات کو یوں سمجھیے: واصل بن عطا جو اپنے عہد میں اپنے معتزلی رجحانات کے سبب ناقابل اعتناء سمجھے جاتے تھے انھوں نے تلاش حق کی بنیاد چار باتوں پر رکھی تھی۔ اولاً، یہ دیکھا جائے کہ اس بارے میں قرآن کیا کہتا ہے۔ ثانیاً، پھر سنت میں اس کے نظائر تلاش کیے جائیں۔ تیسرے مرحلے میں اجماع کو قابل اعتناء سمجھا جائے اور اگر ان تینوں سے کوئی واضح رہنمائی نہ ملتی ہو تو قیاس بمعنی اجتہاد سے مدد لی جائے۔ آگے چل کر واصل کا یہ اصول اربعہ ایک عظیم الشان منہج کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ حتی کہ ان چار اصولوں کو ماخذ شرع کی

ان کا مسلک کیا کہتا ہے، جب ایک بار انسانوں کی گردنوں پر انسانوں کو اختیار حاصل ہو گیا تو نت نئے عناوین سے چھوٹے چھوٹے روحانی خداؤں اور احبارِ اسلام کا ظہور فطری تھا، کہ بعینہ یہی صورت حال پاپائیت نے بعثت نبوی سے پہلے قائم کر رکھی تھی، بلکہ آگے چل کر تو چرچ کے نمائندے گناہ و ثواب کی بخشش اور جنت و جہنم کے پروانے بھی عطا کرنے لگے۔ جس کا جی چاہتا وہ حسب توفیق نذرانہ کے عوض اپنی نجات کا تسلی بخش انتظام کر لیتا۔

حیرت ہوتی ہے کہ جس رسولؐ کا اعزاز یہ ہو اور جس کا فریضۂ منصبی یہ بتایا جاتا ہو کہ اس نے بندوں کی گردنوں کو خود ساختہ پیشواؤں کی گرفت سے آزاد کر کے خدا سے راست مربوط کر دیا، اسی نبی کے دین میں چند ہی صدیاں گزرنے کے بعد روحانی خلافت اور پیری و مریدی کے حوالے سے ایک نئی پاپائیت کیسے متشکل ہو گئی۔ تصوف کی ابتدا دراصل مذہب کے سیاسی استعمال بلکہ استحصال اور بڑھتی ہوئی مادیت کے خلاف ایک احتجاجی مظاہرے کی تھی۔ پھر اسے فاطمیین نے اپنے قالب میں ڈھالنے اور اپنی سیاسی دعوت کو مستحکم کرنے کے لیے تحریک کے طور پر استعمال کیا۔ اہل اللہ کے لبادے میں ایک زیر زمین تحریک کو منظم کرنے کے لیے اسماعیلی داعی مختلف بلاد و امصار میں پھیل گئے۔ اس خفیہ تحریک کی اثر انگیزی کا اندازہ کچھ اس بات سے کیجئے کہ عین فاطمی عہد میں ملتان جیسے دور دراز علاقے میں اسماعیلی ولایت قائم ہو گئی۔ محمود غزنوی کے حملہ سے پہلے تک ملتان برصغیر کی صوفی تحریک کے لیے ہیڈ کوارٹر کا کام انجام دیتا رہا۔ اس بات کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ معین الدین چشتی، قطب الدین

بختیار کاکی اور اس قبیل کے دوسرے بہت سے بزرگوں کا اس چھوٹی سی اسماعیلی ولایت میں بار بار آنا جانا لگا رہا۔ عثمان ہارونی، بہاالدین زکریا، نظام الدین اولیاء، علی ہجویری، بابا فرید، شہباز قلندر اور اس طرح کے جتنے بڑے نام ہیں یہ سب لوگ دراصل جلیل القدر اور پرعزم اسماعیلی داعی تھے جو فاطمی سادات کی اسماعیلی ریاست کو وسعت اور استحکام عطا کرنے کے خفیہ مشن پر مامور تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ باطنی خلافت کے قیام سے فاطمی داعیوں نے اپنے سیاسی زوال کی بڑی حد تک تلافی کر لی اور اس سے بھی انکار مشکل ہے کہ ان حضرات کی اولوالعزمی اور زیرزمین طریقۂ کار کے سبب اسلام کی دعوت ان علاقوں تک پہنچ گئی جہاں سیاسی حالات انتہائی نامساعد بلکہ ناقابل نفوذ تھے۔ البتہ اسلام کا جو تصور ان صوفیا کے ذریعہ لوگوں تک پہنچا وہ دین کی غلوآمیز اسماعیلی تعبیر تھی جس کی بنیاد تفضیلِ علی، پنجتن، ہمہ اوست اور تصرفاتِ نگہِ پیرِ علوی پر رکھی گئی تھی۔ عالم اسلام کے بیشتر صوفی مقابر اور خانقاہیں جو صدیوں سے مرجع خلائق بنے ہوئے ہیں، فی الواقع اسماعیلی دعوت کے زیرزمین مراکز رہے ہیں، حتیٰ کہ تصوف کی بیشتر اصطلاحیں مثلاً پیر، مرید، شریعت، طریقت، باطن اور ظاہر وغیرہ ان ہی حضرات کی وضع کردہ ہیں۔

عباسی خلفاء بھی اہل اللہ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے ناواقف نہ تھے۔ اغلب امکان ہے، نقشبندی سلسلے کو، جو حضرت علیؓ کے بجائے ابوبکر صدیقؓ سے اپنی نسبت جوڑتا ہے، ان کی پشت پناہی حاصل رہی ہو۔ ہماری تاریخ کے بیشتر بزرگ جو اپنے لیے محی الدین کا لقب استعمال کرتے ہیں، مثلاً ابن عربی

یا عبدالقادر جیلانی، ان کی تحریر و تقریر اور چلت پھرت پر فاطمی حوالہ خاصا نمایاں ہے۔ مولانائے روم کا اسماعیلی نظامِ دعوت میں خاصا بڑا مقام ہے جنھوں نے اپنی تمام تر جلالت علمی کے باوجود اپنے آپ کو اسماعیلی امام شمس الدین (شمس تبریز) کی اتباع میں دے رکھا ہے۔ شہرستانی جو بظاہر سنّی فکر میں ایک جلیل القدر عالم کی حیثیت سے دیکھے جاتے ہیں، وہ بھی بباطن اسماعیلی نظام دعوت میں داعی الدعاۃ کے منصب پر فائز ہیں۔ عطار، سعدی، شبستری، نسفی جیسے عبقری جنھوں نے سنّی مسلم ذہن کی تشکیل میں اہم رول انجام دیا ہے، ان کی تحریریں بھی پوشیدہ اسماعیلی تعلق کا پتہ دیتی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو روحانی خلافت کے لبادے میں اسماعیلی داعیوں نے غیر معمولی کامیابی کے ساتھ ایک عالم گیر تحریک منظم کر دی۔ گو کہ انھیں سقوط ملتان کے بعد برصغیر میں کسی ریاست کے قیام کا موقع نہ مل سکا لیکن یہ ضرور ہوا کہ عالم اسلام کے مختلف خطوں میں ان روحانی خلفاء اور ان کے نائبین نے مسلمانوں کی ایک قابل ذکر آبادی کو اپنے دائرہ تصرف میں داخل کر لیا۔

آج اس بات پر کسے یقین آئے گا کہ روحانی خلافت یا پیری مریدی کا یہ کاروبار ایک سیاسی تحریک کا بچا کچھا تلچھٹ ہے جسے وحی ربانی اور اسلام کی فطری ثقافت سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔ بلکہ اسلام تو سرے سے اس خیال کا مخالف ہے کہ انسان اپنی نجات کے نازک ترین مسئلہ کو اپنے ہی جیسے انسانوں کے سپرد کر دے یا یہ کہ انسان اور خدا کے مابین کوئی شخص آسمانی نمائندے کے طور پر متمکن ہو جائے۔ فاطمی تحریک جو ایک نسلی تفوق کے حوالے سے خلافت کی داعی

تھی اپنے انتشار کے بعد بھی گونا گوں فکری التباسات کا سبب بنی رہی۔ آج بھی نزاری اسماعیلیوں کے لیے آغا خان کی ذات ایک ایسے امام کی ہے جس میں خدا خود جلوہ گر ہو۔ دوسری طرف مستعلی اسماعیلیوں کے باقیات مختلف داعیوں کے رحم وکرم پر ہیں جو حق امام اور نذرانوں کے عوض ان کو نجات بخشنے کے منفعت بخش کاروبار میں مصروف ہیں۔ صوفیاء کے وہ سلسلے جنھیں بظاہر سنّی اسلام کی روحانی سیادت کا امین سمجھا جاتا ہے وہاں بھی متولیان کے حق میں صاحب قبر کی 'فیوض و برکات' کا ظہور جاری ہے۔ اس صورت حال نے صدیوں سے امت کو مختلف طرق اور سلسلوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جن لوگوں کو خدا اور اس کے رسولؐ نے امت کی روحانی سیادت پر مامور نہیں کیا، جن کے پاس بیعت سے سرفراز کرنے اور خلعت بانٹنے کے لئے کوئی عقلی اور قرآنی دلیل نہیں ہے، انھوں نے عین ورع وتقویٰ کے لبادے میں کس شقی القلبی کے ساتھ اس مکروہ کاروبار کو جاری رکھا ہوا ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بیعت صرف امیر المومنین یعنی خلیفہ وقت کے لیے ہے اور خلافت کے لیے قوت نافذہ ضروری ہے۔ خلفائے راشدین نے رسول اللہؐ کے غیاب میں ان کے نائب کی حیثیت سے اولوالامر کے منصب کو سنبھالا تھا۔ رہی یہ بات کہ فلاں صوفی نے فلاں سے بیعت کی اجازت حاصل کی ہے، یا فلاں نے فلاں کو اپنا خلیفہ متعین کیا یا خلعت سے نوازا ہے، یا اسے دہلی اور اجمیر کی ولایت پر متمکن کیا ہے، تو یہ سب لغو اور مہمل باتیں ہیں جن کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ بدقسمتی سے

ہمارے بعض موقر علمائے کرام نے، جن میں سے اکثر اسی منحرف اور زوال زدہ سلسلوں کے پروردہ اور رہینِ منت تھے، اس خیالی خلافت کو نہ صرف یہ کہ اعتبار بخشا بلکہ خود بھی اس لغو عمل میں شریک و سہیم رہے، اس لیے عام مسلمانوں کے لیے آج یہ بات سمجھنا انتہائی مشکل ہے کہ پیری مریدی کا یہ مذموم کاروبار، قبروں کی منفعت بخش تجارت اور صاحب قبر کے روحانی تصرفات کے دعوے، یہ سب ایسی باتیں ہیں جن پر شرع سے کوئی دلیل نہیں لائی جا سکتی۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک انسان، خواہ وہ کیسا ہی ولی کامل کیوں نہ ہو، اس کی روح موت کے تین چار سو سال بعد غیر معمولی تصرفات حاصل کر لے، جیسا کہ شاہ ولی اللہ دہلوی کا خیال ہے۔ قرآن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے تو ہمارے لیے یہ سمجھنا بھی مشکل ہے کہ تصوف کے مختلف سلسلوں کا ظہور کوئی آسمانی انتظام ہو یا کسی سلسلہ کو نسبتِ صدیقی، کسی کو نسبتِ فاروقی، اور کسی کو نسبتِ علوی حاصل ہو، اور کسی کو مختلف نسبتوں کے ارتکاز و امتزاج سے مشرف کیا گیا ہو۔ پتہ نہیں شاہ صاحب کو یہ باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں، ملاءِ اعلیٰ سے ان کے رابطے کا ذریعہ کیا تھا۔ ہاں ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ جب تک امت میں ان غیر قرآنی، لغو اور مہمل تصورات کا خاتمہ نہیں ہوتا اور جب تک سادہ لوح انسانوں کی گردنوں کو پھر سے مشائخیت سے آزاد نہیں کرایا جاتا، امت مختلف سلاسل کے حلقوں میں منقسم رہے گی اور وحی ربانی سے اس کا تعلق منقطع رہے گا۔

نسلی سیادت

اسلام نسبی فخر و مباہات کا سخت مخالف ہے۔ اسلامی معاشرے میں کسی شخص

کا عرب یا عجم ہونا، یا کسی خاص خانوادے سے اس کا تعلق، خواہ وہ شرف وفضل میں سماجی طور پر کتنا ہی ممتاز کیوں نہ سمجھا جاتا ہو، قطعی اہمیت نہیں رکھتا کہ یہاں انسانوں کو ممتاز و ممیز قرار دینے کا پیمانہ صرف اور صرف تقویٰ ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کے قرآنی بیان نے تراشیدہ فضل و شرف کے ہر معیار کو ہمیشہ ہمیش کے لیے نیست و نابود کر دیا تھا۔ لیکن اسے کیا کیجئے کہ یہ جاہلی عصبیت جس کا اظہار ابتداً قرشی، طالبی، عباسی جیسے حوالوں سے ہوا، آگے چل کر خلافت و سیادت کے لیے ایک مؤثر حربہ سمجھا جانے لگا۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ خلافت کے فاطمی دعویداروں نے آل فاطمہ کو دوسرے اہل بیت کے مقابلے میں خاص فضل و شرف کا سزاوار قرار دے ڈالا۔ حضرت فاطمہؓ، ان کے شوہر حضرت علیؓ اور دونوں فاطمی بیٹے حسن و حسین پر مشتمل ایک ایسی روحانی فیملی وجود میں آگئی جسے محمد رسول اللہ کے توسیعہ کے طور پر پنجتن پاک کے نام سے کچھ اسی توقیر کا حامل سمجھا جانے لگا جیسا کہ اہل کلیسا کے ہاں Trinity پر مشتمل آسمانی فیملی کو تقدس حاصل ہے۔

آج رسول اللہ سے نسبی تعلق جوڑنے والے سادات کے مختلف سلسلے جو اس سرزمین پر پائے جاتے ہیں اور جنھوں نے اس حوالے سے دین میں مشائخیت کو تسلسل اور استحکام دے رکھا ہے، واقعہ یہ ہے کہ وحی، عقل اور تاریخ کسی بھی اعتبار سے ان کا دعویٰ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ دوسری قوموں کی طرح عربوں میں بھی نسلی فخر و مباہات کے مظاہر پائے جاتے تھے، بلکہ عربوں پر ہی کیا موقوف انسانی تاریخ میں جو لوگ بھی شہنشاہیت یا مشائخیت کے حوالے سے لوگوں کی گردنوں پر مسلط رہے ہیں، انھوں نے اپنے آپ کو آسمانی خانوادوں کا رکن رکین

باور کرایا ہے۔ خلافت کا مسئلہ جب اہلیت اور تقویٰ شعاری کے بجائے قرابت کے حوالے سے دیکھا جانے لگا تو یہ مسائل اہمیت اختیار کر گئے، آیا نبیؐ کی اس وراثت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے۔ مشکل یہ تھی کہ رسول اللہ نے اپنے پیچھے کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی تھی۔ ماکان محمدابااحد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین کی قرآنی آیت واشگاف الفاظ میں اس حقیقت پر مطلع کرتی ہے کہ محمد رسول اللہ نے دنیا میں اپنا کوئی نسلی سلسلہ نہیں چھوڑا ہے۔ وہ تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ ان کی حیثیت خدا کے رسول اور خاتم النبیین کی ہے۔ تاریخی مصادر اس بات پر متفق ہیں کہ آج دنیا کے مختلف گوشوں میں جو لوگ خود کو سادات کہتے یا کہلاتے ہیں، وہ ہاشمی اور مطلبی تو ہو سکتے ہیں، ان کا تعلق ابوطالب، ابوجہل اور عباس و حمزہ کے خانوادوں سے تو ہو سکتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ سے نہیں۔

اسلام میں نسلی سیادت کی راہ کب اور کس طرح ہموار ہوئی اسے بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سنّی اسلام کے چار ائمہ میں سے شافعی قرشی نسبت کے دعویدار ہیں۔ انھوں نے اپنے سفرنامے میں اس حوالے سے اپنی علوئے مرتبت کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ لیکن تب قرشی حوالہ رسول اللہ سے راست نسبت کا دعویدار نہ تھا۔ محمد بن حنفیہ جو حضرت علیؓ کے غیر فاطمی صاحبزادے تھے ان کی انقلابی تحریک کو فاطمی حوالے کے بغیر مقبولیت مل جانا اس خیال پر دال ہے کہ پنجتن کا فلسفہ یا رسول اللہ سے نسلی سلسلہ کا دعویٰ اسماعیلی مبلغین کی خفیہ دعوت و تبلیغ کا مرہون منت ہے۔ اسماعیلی ماخذ میں، جس سے دوسرے شیعہ حلقے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے،

حضرت فاطمہؓ دیومالائی پیکر کی حامل ہیں۔ حسنؓ وحسینؓ کو جنم دینے کے باوجود انھیں بتول بمعنی باکرہ قرار دیا جاتا ہے اور یہ خیال عام ہے کہ ائمہ کی تخلیق میں جو نطفہ استعمال ہوا ہے، اسے عام انسانی تولیدی مراحل سے کچھ بھی علاقہ نہیں۔ اسماعیلی اس خیال کے بھی حامل ہیں کہ ابوطالب کو رسول اللہ کے مستودع کی حیثیت حاصل تھی، سو جب علیؓ بلوغ کو پہنچ گئے تو پھر یہ امامت کا سلسلہ ان کے ذریعہ ان کی اولاد کو منتقل ہوگیا۔ اس اعتبار سے اسماعیلی تکوینی نظام میں حسنؓ وحسینؓ کا تعلق ائمہ کی اس آسمانی فیملی سے جاملتا ہے۔ اس عقیدے کی خفیہ تبلیغ نے رفتہ رفتہ حضرت فاطمہؓ اور پنجتن پاک کی مفروضہ آسمانی فیملی کو اسلام میں مرکزیت عطا کردی۔ اب تک نسبی سلسلہ کے تمام تر دعوے نرینہ اولاد کی بنیاد پر ہوتے آئے تھے اب فاطمہ کے دیومالائی پیکر کی تشکیل نے باپ کے بجائے ماں سے نسبی سلسلہ کی طرح ڈال دی۔ یہ ایک بڑی جسارت آمیز تاریخی دھاندلی تھی جس نے رسول اللہ کے منقطع نسبی سلسلہ کو، جس پر قرآن کی شہادت موجود تھی، امت میں پھر سے جاری کردیا۔ اور اس طرح سادات کے جھوٹے حوالوں سے امت کی گردنوں پر مذموم مشائخیت نے پھر سے اپنی گرفت مضبوط کرلی۔

یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ رسولؐ اللہ کی دوسری بیٹیوں اور ان کی اولاد کو اس عز وشرف سے محروم کرنے اور اس مفروضہ آسمانی فیملی سے بے دخلی کی آخر کیا دلیل ہوسکتی ہے۔ رسول اللہ کی بڑی بیٹی زینبؓ جن کے صاحبزادے علی بن ابوالعاص فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ کی اونٹنی پر سوار تھے، اور جو آگے چل کر جنگ یرموک میں شہید ہوئے اور رقیہؓ اور کلثومؓ جنھوں نے مدینہ میں وفات پائی، اپنے

والد کے مشن میں برابر کی شریک و سہیم رہیں، لیکن ان کی اولاد کو سیاسی مبلغین نے آخر اس عزو شرف کا سزاوار کیوں نہیں سمجھا؟ ان کی اولاد دوسرے بہت سے قرشی النسب مسلمانوں کی طرح تاریخ کے صفحات میں غائب ہوگئی۔ اگر اسماعیلی دعوت نے حضرت فاطمہؓ کو اپنی سیاست کی اینٹ کے طور پر استعمال نہ کیا ہوتا تو پنجتن پاک کا تصور تخلیق پاتا اور نہ ہی رسول اللہ سے نسبی تعلق کے خود ساختہ دعویداروں کی فوج ظفر موج آج خود کو سید کہہ رہی ہوتی۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ سادات کی علوئے مرتبت کا باضابطہ سماجی اظہار آلِ بویہ کی امیر الامرائی کے زمانے میں ہوا، جہاں سادات کے لیے شریف کا لفظ رائج ہوا۔ شریف رضی اور شریف مرتضیٰ کے ناموں میں شرافت کا یہی حوالہ موجود ہے۔ آگے چل کر سادات سے متعلق ہر چیز بلکہ ان کا مولد و مسکن بھی شریف کہلانے لگا، حالانکہ خود ان جگہوں میں شرافت یعنی رسول اللہ سے نسلی تعلق کی کوئی بات یا کوئی شائبہ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ رہے ہندو پاک کے سادات تو اس بارے میں تاریخی شہادت موجود ہے کہ ان میں سے بیشتر محمد الکابلی کی اولاد میں سے ہیں جو حسنی اور حسینی سلسلہ کے بجائے محمد بن حنفیہ یعنی حضرت علیؓ کی غیر فاطمی اولاد میں سے تھے۔ محمد الکابلی کو بسبب خروج اپنی جان بچانے کے لیے کابل میں سکونت اختیار کرنا پڑی جہاں انھوں نے کابل کے غیر مسلم حکمراں کی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔ تاریخ، وحی اور عقل کی روشنی میں رسول اللہ سے نسبی تعلق کے جھوٹے دعویداروں کی اس سے زیادہ اور کچھ بھی حقیقت نہیں۔ رہے ہندو پاک کے مختلف صوفیاء جو اپنے اپنے زمانے میں پوشیدہ اسماعیلی داعیوں کے طور پر ہندوستان میں وارد ہوتے رہے تو

ان کی حیثیت داعیوں کی تھی، جنھیں اسماعیلی ائمہ نے دعوت پر مامور کر رکھا تھا، فی نفسہ ان کا نسلی تعلق ائمہ کی فیملی سے نہیں تھا۔ اس حقیقت کو آج بھی داؤدی بوہرہ حلقوں کے داعی مطلق مانتے ہیں۔ ذریتِ فاطمہؓ کے بارے میں مبالغہ آمیز بیانات کی اشاعت میں بھی فاطمی داعیوں نے کلیدی رول انجام دیا ہے۔ مثال کے طور پر ابن عربی جن کی فکر کا سایہ راسخ العقیدہ سنی فکر پر مسلسل پڑتا رہا ہے، نے فتوحات مکیہ میں اس خیال کی پرزور وکالت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولؐ اللہ سے اگلے پچھلے تمام گناہوں کی معافی کا جو وعدہ کیا ہے اس میں اولادِ فاطمہؓ اور قیامت تک آنے والے ان کے تمام نسبی سلسلے شامل ہیں۔ مسلمانوں میں ایسی روایتوں کی کمی نہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ بڑے سے بڑے گناہ آلِ فاطمہ سے حسنِ سلوک کے سبب دھل جاتے ہیں۔ بلکہ ؎

لی خمسة اطفی بهاحر الوباء الحاطمة

المصطفیٰ والمرتضیٰ وابناهما والفاطمة

(یعنی ہمارے لیے تو پانچ ہیں جن کے لطف و کرم سے وبا کی شدت ختم ہو جاتی ہے: مصطفیٰ اور مرتضیٰ اور دونوں کے دو بیٹے اور فاطمہ) کا اسماعیلی الاصل نغمہ سنی عوام میں بھی کثرت سے شائع اور مقبول ہے جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہ تفوق کے لیے رسول اللہ سے جس نسبی سلسلے کے انقطاع کا اعلان کیا گیا تھا اور جس پر قرآن مجید نے اپنی مہر ثبت کر دی تھی، اسے کتنی ہشیاری کے ساتھ فاطمیین کی خفیہ تبلیغ نے توڑ دیا اور اس طرح اسلام کی حریتِ فکری تراشیدہ نسبی پیشوائیت کے ہاتھوں دم توڑ گئی۔

سنت کی گروہی تعبیر

مسلمانوں کے مختلف گروہ جو آج ایک دوسرے سے الگ اپنا نظری وفکری وجود رکھتے ہیں، ان سبھوں کے پاس سنت رسولؐ پر مشتمل اپنے الگ الگ مجموعے ہیں۔ ایک فرقہ کی کتاب دوسرے فرقہ کے نزدیک قابل اعتبار نہیں، خواہ اس میں رسولؐ کی حدیثیں ہی کیوں نہ پائی جاتی ہوں۔ شیعہ حضرات سنی کتابوں سے صرف اسی وقت تک اشتغال مناسب جانتے ہیں جب تک ان کے موقف کی تائید ہوتی رہے۔ دوسری طرف سنّی علماء شیعی مجموعوں کو یکسر ناقابل اعتناء سمجھتے ہیں۔ ہر فرقہ کو اس بات پر اصرار ہے کہ اس کے پاس سنتِ رسولؐ کا جو مجموعہ ہے، صرف وہی لائق حجت ہے۔ اس صورتِ حال نے امت میں شیعہ، سنی، اسماعیلی، اباضی اور اس کے علاوہ بے شمار ذیلی گروہوں کو جنم دیا ہے۔ یہ گروہ بندیاں چونکہ سنت کے پردے میں فروغ پا رہی ہیں، اس لیے تعصب اور فرقہ بندی کی ان بنیادوں کو منہدم کرنا کچھ آسان نہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ سنت رسولؐ کے ان عاشقوں کو یہ بات کیوں نہیں سمجھ میں آتی کہ رسولؐ اللہ کی حدیث خواہ کسی گروہ کے پاس محفوظ ہو، مسلمان کی حیثیت سے اس کے آگے سرتسلیم خم کرنا ہمارے ایمان کا لازمہ ہے۔ پھر ہم محض اس لیے کسی حدیث کو کیسے مسترد کر سکتے ہیں کہ وہ ہمارے فرقہ کی کتابوں سے باہر پائی جاتی ہے۔ اگر سنت ان ہی کتابوں میں جلوہ گر ہے، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، تو امت کے سبھی فرقے کسی نہ کسی سطح پر منکرین حدیث کی فہرست میں شامل ہیں کہ وہ دوسرے فرقے کی کتابوں میں پائی جانے والی حدیثِ رسولؐ کو اپنے فکر وعمل کی بنیاد بنانے سے گریزاں

ہیں۔ عام مضطرب مسلمان جو فرقہ بندی سے نالاں اور وحدتِ امت کا خواہاں ہے وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ مسلمانوں میں فرقہ بندی کی بنیادیں دین وسنت کے حوالے سے قائم ہیں تو اس کی ہمت پست ہو جاتی ہے۔ اسے اس نتیجہ پر پہنچنے میں دیر نہیں لگتی کہ اگر یہ معاملہ واقعی دین کا ہے اور ان کتابوں میں اگر متضاد اور متحارب روایتیں واقعی اقوالِ رسول ہیں تو قیامت تک یہ فرقے متحد نہیں ہو سکتے اور یہ کہ چوتھی صدی ہجری سے امت میں تقسیم در تقسیم کا جو عمل شروع ہوا تھا، اس پر دنیا کی کوئی قوت بند نہیں باندھ سکتی۔

تو کیا امتِ مسلمہ کا فکری انتشار اور مختلف فرقوں کے مابین کبھی نہ ختم ہونے والی خانہ جنگی ہی اس کا مستقبل ہے؟ کیا یہ امت پھر سے جسد واحد میں تبدیل نہیں ہو سکتی؟ گو کہ صدیوں سے ہمارے مفکرین اس صورت حال پر نالہ کناں رہے ہیں، فرقوں کو اپنی تشتتِ فکری کے لیے دینی بنیاد مل جانے کے سبب انھیں آگے راستہ مسدود نظر آیا، لہٰذا انھوں نے اس تکلیف دہ صورت حال کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ اب عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ہمیں اسی باہمی تضاد اور تفرقے کے ساتھ زندہ رہنا ہے کہ امت کا متحدہ قالب اب دوبارہ تشکیل نہیں پا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ روز بروز ہمارا ملی گراف گرتا جاتا ہے۔ نئی ابتداء کا ہر منصوبہ داخلی اختلاف اور منافرت بلکہ کہہ لیجئے کہ باہمی سازشوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس تکلیف دہ صورت حال سے نکلنے کے لیے لازم ہے کہ ہم اس تاریخی عمل کو سمجھنے کی کوشش کریں جس کے نتیجہ میں سنت کا مروجہ تصور پیدا ہوا اور جس نے

امت کو متحد اور مضبوط بنانے کے بجائے اسے متحارب گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ اگر ہم اس نکتہ کو سمجھ سکیں کہ سنت کا مروجہ تصور اور اس کی شیعی، سنی تقسیم ایک خاص سماجی اور سیاسی عہد کی پیداوار ہے، جب مسلمان باہمی خانہ جنگی اور سیاسی گروہ بندی کی لعنت میں مبتلا تھے، جب عالم اسلام میں بیک وقت تین خلافتوں کا ظہور رہوا اور جب اضمحلال خلافت کے جھٹپٹے میں آل بویہ کی امیر الامرائی، سلجوقیوں کی سلطانی اور علماء و متصوفین کی مشائخیت کے لیے سازگار ماحول میسر آ گیا۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے چند اہم سوالات پر غور کرنا مناسب ہوگا۔

سنت کے سلسلے میں شیعوں اور سنیوں کے ہاں دو الگ الگ حدیثیں پائی جاتی ہیں جس کے سبب ان کے راستے الگ ہو گئے ہیں۔ سنی حدیث کے مطابق، رسولؐ اللہ سے منسوب ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں اپنے پیچھے دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جنھیں تم اگر پکڑے رہے تو گمراہ نہ ہوگے اور وہ ہے خدا کی کتاب[1] اور میری سنت۔ شیعہ کہتے ہیں ان دو چیزوں سے مراد خدا کی کتاب اور عترت اہل بیت ہے۔ آپ نے دیکھا کہ پہلی چیز میں تو دونوں فرقوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں ہی قرآن سے تمسک کو فرمانِ رسولؐ مانتے ہیں۔ البتہ اختلاف اس بات پر ہے کہ دوسری چیز جس کا آپ نے حکم دیا وہ سنت ہے یا عترت۔ یہ وہ نازک امر ہے جس پر مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں اس لیے اس نکتہ پر ذرا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ مسئلہ کی تفہیم کے لیے دونوں گروہوں سے بیک وقت یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر رسولؐ اللہ نے واقعتاً سنت یا عترت سے تمسک کا حکم دیا تھا تو اس سے آپ کی

مراد کیا تھی؟ کتاب اللہ کے ذکر سے توفی الفور ہمارے ذہن میں ایک ایسی معین کتاب کا تصور آجاتا ہے جسے قرآن مجید کہتے ہیں، البتہ سنت کے حوالے سے اہل سنت کے مقبول عام مجموعے جنھیں آج ہم صحاح ستہ کہتے ہیں یا عترت آل بیت کے مستند ماخذ کی حیثیت سے کلینی، ابن بابویہ، استبصار طوسی اور نہج البلاغہ کی تحریریں، ان تمام کتابوں کے وجود سے عہدِ رسولؐ کے مسلمان قطعی ناواقف تھے۔ احادیث وروایات کی یہ تمام کتابیں تیسری اور چوتھی صدی میں وجود میں آئیں پھر عہد رسولؐ کے مسلمان سنت یا عترت کی تلاش میں کن مجموعوں سے اشتغال کیا کرتے تھے؟ جن کتابوں کو ہم آج سنت یا عترت کا لازوال ماخذ قرار دیے بیٹھے ہیں اور جن کے حوالے سے مذہبی گروہ بندی کی عمارت قائم ہے، وہ کتابیں تو اس وقت وجود میں بھی نہ آئی تھیں۔ پھر یہ دعویٰ کہاں تک حق بجانب ہے کہ سنت صحاح ستہ میں جلوہ گر ہے اور عترت سے شیعوں کی کتب اربعہ مراد ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جب سنت اور عترت کے مجموعے ناپید تھے، تو پہلی نسل کے مسلمان اس سے کیا مراد لیتے تھے؟ اس روایت کی ثقاہت سے قطع نظر یقیناً سنت کے نام پر ان کا ذہن صحاح ستہ کی طرف نہ جاتا ہوگا اور نہ ہی عترتِ آل بیت کی تلاش میں شیعوں کی کتب اربعہ ان کی نگاہوں میں جھلملاتی ہوگی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آل بیت کے سلسلے کو ابھی پھلنا پھولنا باقی تھا۔ ابتدائے عہد کے مسلمان نہ بارہ اماموں کے نام اور ان کے آثار وفرمودات سے واقف تھے اور نہ ہی انھیں اصح کتاب بعد کتاب اللہ سے اشتغال کا شرف حاصل تھا۔ پھر یہ بات بآسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ سنت یا عترت سے خواہ

کچھ بھی مراد ہو، ان مجموعوں کی طرف اشارہ ہرگز مقصود نہ تھا۔

اس نازک اور حساس مسئلہ پر ایک اور پہلو سے غور کیجئے۔ اگر سنت یا عترت واقعتاً دین میں قرآن جیسی اہمیت کا حامل تھا تو رسول اللہؐ نے قرآن کی طرح ان کے مستند مجموعے اپنے پیچھے کیوں نہیں چھوڑے؟ کہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اختلافات کی یہ سنگینی اور باہمی منافرت کے فروغ کی مذہبی بنیادیں سرے سے قائم ہی نہ ہوتیں۔ خدا اور اس کے رسولؐ سے بہتر اس نکتہ کو اور کون سمجھ سکتا ہے کہ اتحاد میں قوت اور اختلاف میں سراسر خسارہ ہے۔ قرآن مجید تو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لینے اور تفرقہ میں نہ پڑنے کا حکم دیتا ہے، وہ ہمیں اس نکتہ سے آگاہ کرتا ہے کہ مسلمانو اگر تم اختلاف کی راہ پر چل نکلے تو دشمنوں کے مقابلے میں تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے فرقہ بندی اختیار کی اور گروہوں میں بٹ گئے تو ان کے بارے میں قرآن کا واضح فتویٰ ہے کہ ان کا دین جاتا رہا (لست منهم فی شئی)۔ پھر یہ آخر کیسے ممکن ہے کہ جو رسولؐ اپنی زندگی میں قرآن مجید کے حفظ و کتابت کا اس قدر التزام کرتا ہو اور اسے ایک مکمل کتاب کی شکل میں اپنے پیچھے چھوڑ جانے کا اہتمام کرتا ہو، وہ دوسرے ماخذ کے سلسلے میں سرے سے کوئی اہتمام ہی نہ کرے۔ بلکہ نبیؐ کے کبار اصحاب اور ان کے خلفاء بھی اقوال رسولؐ پر مشتمل کسی مجموعے کی ترتیب و تدوین سے پہلو تہی کرتے رہیں۔ پھر یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ یہ تمام کتابیں جو تیسری اور چوتھی صدی کے محدثین نے مرتب کیں تو یہ اپنی تمام تر صحت اور ثقاہت کے باوجود تیئیس سالہ نبوی شب و روز کا مکمل احاطہ نہیں کرتیں اور نہ ہی ان مرتبین کو یہ

دعویٰ ہے کہ رسول اللہ کا ہر قول اور آپؐ کے ہر عمل کا ریکارڈ ان مجموعوں میں جمع ہو گیا ہے۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ سنتِ رسولؐ کا کوئی مکمل ریکارڈ جس میں رسول اللہ کا ہر قول اور آپؐ کے تیئیس سالہ نبوی شب و روز کی تمام تر تفصیلات موجود ہوں، آج اس امت کے پاس نہیں پایا جاتا؟ اگر ایسا ہے تو سنت سے تمسک کرنے والے سنت کاملہ کی تلاش میں کہاں جائیں گے؟ کچھ یہی مشکل عترتی آل بیتی کی تعبیر کے ساتھ بھی ہے۔ مسلمانوں کے مختلف گروہ آل بیت کا مختلف تصور رکھتے ہیں۔ بعض کے نزدیک آلِ بیت محض پنجتن تک محدود ہے۔ بعض اسے بارہ یا سات اماموں میں متشکل دیکھتے ہیں، بعض اس سلسلے کو آج بھی جاری سمجھتے ہیں، بعضوں کی تاویل کے مطابق آلِ عباس بھی حدیثِ کسا کے حوالے سے آلِ بیت میں شامل ہیں، بعض ازواج نبی کو ان میں شامل سمجھتے ہیں اور بعضوں کے نزدیک پوری امت مسلمہ حاملینِ مشن کی حیثیت سے رسول اللہ کی آل میں شامل ہے۔ گویا عترت بھی سنت کی طرح ایک ایسا مبہم تصور ہے جس کا حدود اربعہ متعین نہیں کیا جا سکتا۔

سنت اور عترت کا یہ اختلاف اور اسوۂ رسولؐ کی یہ متحارب تاویلات جس نے امت کو کوئی ایک ہزار برسوں سے مختلف فرقوں میں تقسیم کر رکھا ہے، ان کی ابتدائی صورت گری تو تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں شروع ہوئی البتہ انھیں تقدیس و اعتبار ملنے میں مزید کئی صدیاں لگیں جب جا کر یہ تصور عام ہوا کہ ان انسانی تالیفات میں ایام و آثار کا جو علم مدون ہوا ہے وہ تمام شک وشبہ سے بالاتر ہے اور جس کے تنقیدی محاکمہ سے ہمارے مسلک اور فرقے کی بنیادیں ہی نہیں

ہلتیں بلکہ ترکِ سنت کے سبب ہمارا ایمان بھی جاتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ سنت بمعنیٰ سنتِ رسولؐ قرآن کی اصطلاح نہیں ہے۔ قرآن مجید میں سنت اولین اور سنت اللہ جیسے الفاظ تو پائے جاتے ہیں، سنت رسولؐ کی کوئی اصطلاح نہیں ملتی۔ ہاں مومنین کو اس بات کی تلقین ضرور کی گئی ہے کہ ان کے لیے رسولؐ اللہ کی ذات گرامی میں اسوۂ حسنہ یعنی بہترین نمونہ موجود ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم مسلمانوں کے لیے رسولؐ اللہ کی شخصیت اپنے تمام تر ابعاد کے ساتھ لائق تقلید و اتباع ہے۔ ہماری یہ مجال نہیں کہ رسولؐ اللہ کا کوئی قول جب ہمارے سامنے آجائے تو ہم اس کی تعمیل میں ادنیٰ تامل کا بھی مظاہرہ کریں کہ ایسا کرنا ہمارے ایمان کے لیے سم قاتل ہے۔ البتہ رسولؐ سے ہماری محبت ہم سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ قولِ رسولؐ کی صحت کے سلسلے میں ہم حد درجہ احتیاط کا مظاہرہ کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس بات پر ہم قولِ رسول سمجھ کر ایمان لے آئے ہوں اس کی اصل مشکوک ہو کہ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو پھر اس کی حیثیت رسولؐ اللہ پر اتہام، بہتان اور کذب کی ہوگی جس کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے: من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار۔

یہ تمام انسانی کاوشیں جن کی جمع و تدوین میں انسانی عقل و بصیرت اور جن کے چھان پھٹک میں انسانی پیمانے استعمال ہوئے ہیں اور جس کے سبب محدثین کے درمیان روایت اور راویوں کے سلسلے میں اختلاف واقع ہو گیا ہے، مکمل ثقاہت کا دعویٰ نہیں کر سکتیں، لہذا کوئی وجہ نہیں کہ ایام و آثار کے سنی یا شیعی مجموعوں کو اپنے اپنے حلقوں میں تقدیس اور حجیت کی حیثیت حاصل ہو۔ بخاری

ہوں یا مسلم کلینی ہوں یا ابن بابویہ اللہ تعالیٰ نے انھیں سنت کی تجمیع وتدوین پر مامور نہیں کیا تھا۔ نہ ہی خدا کا ہم سے یہ مطالبہ ہے کہ ہم ان انسانی علمی کاوشوں پر آسمانی کتابوں کی طرح ایمان لے آئیں۔ پھر جس چیز کا خدا نے ہمیں مکلف نہ کیا ہو اسے جزو دین قرار دینے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ جمع وتدوین کی یہ انسانی کاوشیں اگر واقعتاً کسی خدائی انتظام کے تحت انجام پاتیں اور یہ کتابیں اگر واقعتاً وحی کا اظہار ہوتیں تو ان کی روایتوں میں اس قدر باہم اختلاف نہ ہوتا۔ قرآن مجید کی یہ آیت ان مجموعوں پر بھی صادق آتی ہے: ولو کان من عند غیراللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا۔

سنت ایک جاری عمل ہے۔ ہر معاشرے میں معروف ومنکر کے حوالے سے گزرتے وقتوں کے ساتھ بعض روایات مستحکم ہوتی رہتی ہیں۔ البتہ حالات کی تبدیلی اور زمان ومکان کے بدل جانے سے اس روایت کے از سر نو محاکمہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کے برعکس اسوۂ رسولؐ اس لازوال پیغام کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے غایت اہداف میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ ابتدائی عہد کے مسلمان سنت رسولؐ کے سلسلے میں ایک خلاقانہ رویہ کے حامل تھے۔ مثال کے طور پر جب حضرت عمرؓ نے خراجی زمینوں کے سلسلے میں رسول اللہ کی سنت کی ظاہری اتباع کے بجائے انصاف کی روح کو برقرار رکھنے کی کوشش کی، یا جب انھوں نے مولفۃ القلوب کے سلسلے میں نبیؐ سے علیحدہ موقف اختیار کیا، یا قحط کے زمانے میں قطع ید کی حد کو معطل کردیا، تو ان کا یہ خیال تھا کہ یہ اقدامات بدلے ہوئے حالات میں کہیں زیادہ قرینِ انصاف ہیں۔ گویا سنت اگر نظائر رسولؐ

کا نام ہے اور اگر اس سے مراد رسول اللہ کے عملی اقدامات ہیں تو یہ ایک مسلسل نمو پذیر عمل ہے جس کی ظاہری شکل وصورت ظروف ومکان کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی جائے گی۔ بھلا رسول اللہ کے جلیل القدر اصحاب سے زیادہ ان کی سنت کا پیروکار اور کون ہوسکتا ہے؟ لیکن تب سنت کوئی منجمد شئی نہ تھی بلکہ یہ ایک جاری عمل کا نام تھا۔ اصحاب نبیؐ کی نگاہیں ظواہر سنت کے بجائے روح سنت پر مرکوز تھیں۔ لہذا نظائر نبوی سے اختلاف کو وہ سنت کی پامالی پر محمول نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کو یہ جرأت ہوتی کہ وہ ان پر منکرین سنت ہونے کی پھبتی کستا۔

رسول اللہ سے غیر معمولی تعلق اور جذباتی وابستگی کے سبب ایام وآثار کے علم میں مسلمانوں کی شروع سے ہی دلچسپی رہی۔ اور اس میں کچھ حرج بھی نہیں کہ اپنے محبوب رسولؐ کے ایام وواقعات کا مجلسوں میں ذکر رہے اور ان مقدس یادوں سے مشامِ جاں کو معطر رکھا جائے۔ محدثین کی مجلسوں میں عوام الناس کا اژدہام اسی غیر معمولی محبت کے سبب رہا۔ جوں جوں رسول اللہ کے اصحاب دنیا سے اٹھتے گئے ان مقدس شب وروز کی ترتیب وتدوین کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت محسوس ہونے لگی۔ لوگوں نے ذاتی طور پر اپنے مجموعے مرتب کر رکھے تھے لیکن رسول اللہ کے اس حکم کے سبب، جیسا کہ مسلم میں منقول ہے: لاتکتبوا عنی شیئا غیرا القران فمن کتب عنی غیر القران فلیمحه۔ یعنی قرآن کے علاوہ مجھ سے کسی اور بات کو تحریر میں نہ لاؤ اور کسی نے اگر کچھ لکھ رکھا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اسے مٹادے ---، کسی کی یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ عوامی یا سرکاری سطح پر باقاعدہ تدوینِ حدیث کا اہتمام کرتا۔ بخاری ومسلم کے مجموعے جو اپنی تدوینی

خوبیوں اور تراجم ابواب کے باعث قبولیتِ عامہ حاصل کر گئے، یا کلینی کی اصول وفروع جو شیعی نقطۂ نظر کے باعث آگے چل کر شیعی مذہب کی اساس بن گئیں، ان کی ترتیب واشاعت کا فیصلہ ان حضرات کا ذاتی اجتہاد تھا، اسے نہ تو امت کے مشترکہ ایجنڈے کی حیثیت حاصل تھی اور نہ ہی خلیفۂ وقت کی ایماء پر اسے انجام دیا گیا تھا۔ اپنے عہد میں یہ مجموعے، دوسرے بہت سے مروجہ مجموعوں کی طرح، عہدِ رسول کے تاریخی بیان کی حیثیت سے دیکھے جاتے۔ ان کی حیثیت تقدیسی، تشریعی، یا سنت کے لازوال مآخذ کی نہیں تھی کہ اگر ایسا ہوتا تو امام مسلم اس بات کی جسارت نہ کرتے کہ وہ اپنے دو اساتذہ ذہلی اور بخاری کے جھگڑے میں اول الذکر کی مخالفت میں اس حد تک آگے چلے جاتے کہ ان سے حاصل کردہ ساری حدیثیں انھیں واپس کر دیتے۔ تب ایام وآثار کے یہ بیانات نزاعی سیاسی تناظرات کی حیثیت سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی حیثیت منسوب الی الرسولؐ اقوال کی تھی، مجرد اقوال رسولؐ کی نہیں۔ ان کتابوں میں کہیں خلافت کو آل عباس کا حق بتایا جاتا تو کہیں اسے آل فاطمہؓ کے لیے مخصوص سمجھا جاتا، کہیں غدیرخم میں حضرت علیؓ کی تنصیب امامت کا بیان مذکور ہوتا اور کہیں یہ بتایا جاتا کہ حضرت عمرؓ نے وقتِ وصالِ نبی آپؐ کو وصیت لکھوانے سے روک دیا تھا اور کہیں یہ بتایا جاتا کہ شیخین نے حضرت علیؓ کو حق خلافت سے محروم کرنے کے لیے اس مسئلہ کو آپ کی عدم موجودگی میں کچھ اس طرح بعجلت نپٹایا کہ باہمی جنگ وجدال میں جاہلیت کا سا سماں پیدا ہو گیا۔ تب ان بیانات کو تاریخی رنگ آمیزی کا نتیجہ سمجھا جاتا۔ صحاح ستہ، مسند احمد اور حدیث کی دوسری سنّی کتابوں میں ان

روایات کا پایا جانا اسی سبب ہے کہ تب یہ کتابیں ہماری مشترکہ ثقافتی میراث سمجھی جاتی تھیں۔ البتہ جب چوتھی صدی ہجری میں تقسیم خلافت کے سبب عباسی، فاطمی اور اثنا عشری فرقے وجود میں آ گئے اور ان فرقوں کو ریاست کی سرپرستی بھی مل گئی، تو ان فرقوں نے اپنی اپنی کتابیں الگ کرلیں۔ شیعوں نے کتب اربعہ کو سیاسی تاریخ سے آگے بڑھ کر دین اور عقیدے کی حیثیت دے ڈالی اور سنیوں نے شیعوں کے متروکہ مجموعوں کو صحاح ستہ کا تقدیسی مقام عطا کر دیا۔ ہمارے لیے یہ کہنا تو مشکل ہے کہ صحاح ستہ کی اصطلاح کا واقعی موجد کون ہے اور یہ اصطلاح پہلے پہل کب استعمال ہوئی، البتہ ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ہزار سال گزرنے کے باوجود علمائے حدیث کا اس بات پر اتفاق نہیں ہو سکا ہے کہ صحاح کی ان چھ کتابوں میں کون کون سے مجموعے شامل ہیں۔ بعضے موطا کو اس میں شامل سمجھتے ہیں اور بعضوں کو اصرار ہے کہ یہ مقام ابن ماجہ کو ملنا چاہیے۔ رہا اصح کتاب بعد کتاب اللہ کا مبالغہ آمیز بیان تو بعضوں کے نزدیک اس سے مراد بخاری ہے جب کہ بعض مسلم کو اس منصب کا سزاوار سمجھتے ہیں۔

خلیفہ منصور کے عہد میں امام مالک نے موطا کو امت کے لیے فقہی اور تشریعی مقام عطا کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ انھیں اس بات کا اندازہ تھا کہ کسی علمی کاوش کو خواہ اس کی ترتیب تدوین میں کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتی گئی ہو، تشریعی منصب نہیں عطا کیا جا سکتا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ جس کام میں زمانی اور مکانی قربت کے باوجود امام مالک کو تامل رہا ہو، اسے بعد کے مدونین کے لیے روا رکھا جائے۔

جدید حزبیت

خلافت کی تقسیم اور اس کا اضمحلال اگر شیعہ، سنّی، اسماعیلی، اباضی جیسے فرقوں کے استحکام کا باعث ہوا اور اگر وقتی مصالحانہ سیاسی اقدام نے ائمہ اربعہ کے خیموں کو دوام اور تقدس عطا کر دیا تو بیسویں صدی میں سقوط خلافت کے بعد اس سیاسی خلا کو پر کرنے کے لیے جو پر شور تحریکیں وجود میں آئیں، وہ بھی امت میں مزید نئے خیموں کے قیام کا سبب بن گئیں۔ جس طرح ہمارے متقدمین نے سیاسی اختلاف کو عقیدے کا رنگ دینے کی غلطی کی اور جس کے نتیجے میں ایک امت میں مختلف امتیں وجود میں آگئیں، بعینہ یہی غلطی بیسویں صدی کی ان تحریکیوں سے جوش اصلاح میں سرزد ہوگئی۔ حسن البنّا کی اخوان المسلمین، مولانا الیاس کی تحریکِ ایمان اور ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعتِ اسلامی جو ابتداً اسلام کے اجتماعی نظام کے احیاء کے لیے اٹھی تھیں اور جن کا مقصد امت کو ایمان واخلاص اور اس کے اصلی مشن پر از سرِ نو منظم کر دینا تھا، ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے، کہ یہ تنظیمیں فی نفسہ گروہی نفسیات کی اسیر بن گئیں۔ اب تک مسلمان شیعہ سنّی جیسی فرقہ بندیوں میں مبتلا تھے یا پھر متحارب فقہی گروہ بندیوں اور روحانی خلافت کے دعویداروں نے ان کی اجتماعی زندگی کا تاروپود بکھیر رکھا تھا، اب یہ نئی تحریکیں امت کی وحدت اور اجتماعیت کو منظم کرنے کے بجائے مزید نئے خیموں کے قیام کا سبب بن گئیں۔ گو کہ ابتدا میں ان تحریکیوں کے بانیان کو سخت عوامی مخالفت کا سامنا رہا۔ ٹرین میں بیٹھا مسافر جس طرح ہر نئے آنے والے کے لیے تنگ دلی اور تحفظات کا اظہار کرتا ہے کچھ یہی صورت حال ان تحریکیوں کے

ساتھ بھی رہی۔ مثال کے طور پر جمیعۃ العلماء اور مسلم لیگ کی مقبولیت کے زمانے میں امت کے علماء اور سواد اعظم دونوں کا رویہ جماعت اسلامی کی طرف مکمل استرداد کا تھا لیکن جب رفتہ رفتہ جماعت نے اپنا خیمہ مستحکم کر لیا تو ابوالاعلی مودودی کی جماعت بھی سبیل المومنین کا حصہ سمجھی جانے لگی۔ بیسویں صدی میں تجدید و اصلاح کے نام پر جو تحریکیں اٹھیں ان کی خدمات یقیناً لائق تحسین ہیں البتہ ان تحریکوں کا اپنا کام کر جانے کے بعد ان کے تلچھٹ (residue) کا مستقل نظری گروہ کے طور پر باقی رہ جانا وحدتِ امت کے لئے یقیناً فال نیک نہیں۔ بیسویں صدی کی یہ تنظیمیں جب تک ایک وقتی response کے طور پر دیکھی جاتی تھیں، ان سے وحدتِ امت کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ البتہ آگے چل کر جب یہ تنظیمیں اپنے بانیان کی تحریروں کی بنیاد پر ایک مستقل نظری گروہ کی حیثیت اختیار کر گئیں اور ان پر ایک وقتی تحریک کے بجائے cult کا سا رنگ و آہنگ غالب آتا گیا، تب کہیں جا کر اس صورتِ حال کی سنگینی کا کسی قدر اندازہ ہو سکا۔ اب یہ مختلف جماعتیں جو دین کی مختلف تعبیر اور امت کے لیے مختلف پروگرام رکھتی ہیں، انھیں باہم متحد اور متفق کرنا کچھ آسان نہیں۔ ہر جماعت ایک متبادل امارت و خلافت کا ایک تنظیمی نظام رکھتی ہے جہاں ڈسپلن کے نام پر تنظیمی امیر اپنے متبعین سے خلیفۂ وقت جیسی اتباع کا طالب ہے۔ ان جماعتوں کے علاوہ ایسے افراد بھی میدان میں آئے ہیں جنھوں نے تعبیر دین کے حوالے سے منہاج انٹرنیشنل، الرسالہ مشن یا قرآنین جیسے ناموں سے ایک نئی نظری شناخت کو منظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ تجدید

واحیاء اور دعوت و تبلیغ کے نام پر ان مختلف گروہوں نے اجتماعیت کی تشکیل کے بجائے گروہی شناخت کو ہی مزید منظم اور مستحکم کیا ہے۔ اب ان گروہی شناختوں پر تحریک کے بجائے cult کا کہیں زیادہ گمان ہوتا ہے۔ گویا جس امت کو پہلے سے ہی شیعہ۔ سنی فرقہ بندی کا سامنا تھا، جس کا وجود صدیوں سے حنفی شافعی کی باہمی خونریزیوں سے لہولہان تھا، اب اسے ہمارے عہد میں تبلیغی، جماعتی، سلفی، جمیعۃ العلمائی، دیوبندی، بریلوی اور ان جیسے بے شمار داخلی خلفشار کا سامنا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ان شناختوں کے بطن سے مسلسل نئی نئی شناختیں رونما ہو رہی ہیں۔ ایک جماعت جب دو حصوں میں بٹتی ہے، یا ایک مدرسہ جب اندرونی خلفشار کے نتیجہ میں دارالعلوم اور دارالعلوم وقف کے ناموں سے بٹ جاتا ہے تو عام مسلمانوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حق کس کے ساتھ ہے۔ دارالعلوم دیوبند ہو یا مظاہر العلوم، جمیعۃ العلماء ہو یا سلفی تحریک، اس کی تقسیم در تقسیم کے عمل سے عام مسلمانوں کے ذہن میں اس سوال کی دھار تیز ہوتی جاتی ہے آیا انتشار اور افتراق اسلام اور اسلامیان کی بنا کا جزو لاینفک ہے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ جو علمائے ربانیین امت کو شب و روز اتحاد کی تلقین کرتے ہیں خود ان کی جماعتیں اور مدارس منقسم اور ان کے جھگڑے سرکاری عدالتوں میں زیر سماعت ہیں؟ دین کے نام پر ہماری یہ چلت پھرت، جس نے ہمیں ایک انتشار مسلسل سے دوچار کر رکھا ہے، اور جس کے سبب آج مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور فرقوں کا ربانی مشن پر اتحاد و اتفاق ناممکن ہو گیا ہے، آخر یہ صورت حال ہمیں کہاں لے جائے گی؟

آگے راستہ مسدود ہے، گروہی اسلام کے ہزار سالہ سفر نے ہمیں ایک ایسی بند گلی میں پہنچا دیا ہے جہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل دکھائی نہیں دیتی۔ اب تک اس انتشار و افتراق کے ازالے کی جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں، ان پر اسی فرقہ وارانہ طرز فکر اور فقہی منہج کا سایہ رہا ہے جن پر دراصل ان مسائل کو جنم دینے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں جس طریقہ کار نے مسائل کو جنم دیا ہو اسی طریقۂ کار پر مزید عمل پیرا رہ کر اس صورت حال کا تدارک نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے تو ضرورت ایک نئی ابتداء کی ہوتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ روایتی اسلام کے علمبردار اور ہمارے نظری، فکری اور تاریخی حوادث کو دین و ایمان کا تقدس عطا کرنے والے اصحاب علم ایک نئی ابتداء سے خائف ہیں۔ انھیں اندیشہ ہے مبادا اصلاح و اجتہاد کی کوئی واقعی کوشش کہیں تاریخی اسلام کی عمارت ہی زمیں بوس نہ کر دے۔

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے، قوموں کی زندگی میں

ہمارا نظری اور فکری انحراف جس کی ابتدا تو سیاسی اختلاف سے ہوئی لیکن تیسری چوتھی صدی میں اسے باقاعدہ پھل پھولنے کا موقع میسر آیا، بعد کی صدیوں میں روز افزوں ترقی پذیر رہا، تا آنکہ کہ امت کا اجتماعی ڈھانچہ اپنے داخلی خلفشار کے بوجھ تلے زمیں بوس ہو گیا۔ اموی، فاطمی اور عباسی خلافتوں کے سقوط میں بیرونی عوامل سے کہیں زیادہ اندرونی اختلاف کی کارفرمائی رہی۔ مغل، صفوی اور ترک خلافت کے سقوط سے بھی یہی سبق ملتا ہے کہ ہمیں ہمارے علاوہ

کوئی دوسرا زیر نہیں کرسکتا۔ آج بھی عالمِ اسلام کی ممکنہ وحدت اور اس کے احیاء کو سب سے بڑا خطرہ خود اس کے اندرون سے درپیش ہے۔ اپنے گردوپیش پر کھلی نگاہ ڈالیے تو یہ نکتہ مزید مبرہن ہو جاتا ہے۔ یاد کیجیے! ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جب جہادِ افغانستان میں مسلمانوں کے عزم و حوصلہ اور ان کی غیر معمولی قربانیوں نے دنیا کی سب سے بڑی فوج کو شکست سے دوچار کیا تھا، لیکن جب ایک نئے نظام کی تشکیل کا وقت آیا تو نسلی، قبائلی، فقہی اور گروہی عصبیتوں کے سبب ہماری تلواریں آپس میں ہی الجھ کر رہ گئیں۔ طالبان کا فقہی اسلام دوسرے فرقوں کے لیے ایک تعزیر و تعذیب بن کر رہ گیا۔ پاکستان جو اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر حاصل کیا گیا اور جس کے حصول میں لاکھوں انسانی جانوں کی قربانیاں ہی نہیں بلکہ برصغیر میں اسلام کا ماضی و مستقبل بھی قربان ہو کر رہ گیا، وہاں ہم اس نکتہ پر متحد نہ ہو سکے کہ یہاں کون سا اسلام ریاست کا مذہب بننے کا سزاوار ہے؟ یعنی کس فرقہ اور فقہ کو بالادستی حاصل ہونا چاہیے۔ کل حزب بما لدیھم فرحون کی اس صورتِ حال نے بالآخر سیکولر ڈیموکریسی کے لیے راہ ہموار کر دی۔ دین بمعنیٰ فرقہ کی سیاست جوں جوں آگے بڑھتی گئی، اہل قبلہ کے ایک گروہ کے لیے دوسرے گروہوں کو برداشت کرنا مشکل ہوتا گیا۔ ادھر مشرقِ وسطیٰ میں شیعہ سنّی منافرت باضابطہ ریاستی سرپرستی میں مسلسل روبہ عروج ہے۔ نہ جانے کب یہ لاوا پھٹ جائے اور یہ آگ عالم اسلام کی مرکزی سرزمین کو - خدانہ کرے - ایک خوفناک تباہی سے دوچار کر دے۔ یہ ہے وہ صورتِ حال جس سے آج ہم دوچار ہیں اور جو یقیناً ہمارے ہزار سالہ فکری انحراف کے منطقی ثمرہ

اور اس کے ارتکاز کے طور پر ہمارے حصہ میں آیا ہے۔ گویا حالات انتہائی سنگین ہیں جس پر بند باندھنے کا کام اب محض روایتی ترکیبوں سے نہیں چل سکتا۔

پس چہ باید کرد

اگر ہم اس حقیقت کا ادراک کر سکتے ہوں کہ دین کی یہ فرقہ وارانہ تعبیر جس نے ہمیں صدیوں سے ایک نظری تشتت اور باہمی خانہ جنگی سے دوچار کر رکھا ہے اور جسے ہم غلطی سے عین دین سمجھ بیٹھے ہیں، اس کا کوئی تعلق محمد رسول اللہ کے دین سے نہیں، بلکہ یہ دراصل ہماری بحرانی تاریخ کی پیداوار ہے، تو ہمارے لیے امکانات کی ایک نئی دنیا آباد ہو سکتی ہے۔ ہمارا باہم منقسم اور متحارب ہونا نہ تو خدا کو مطلوب ہے اور نہ ہی ایسا تعلیماتِ پیغمبر کے حوالے سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی - جو ہم مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے - شیعہ، سنی، حنفی، مالکی، سلفی، ظاہری جیسے تراشیدہ حوالوں کے لیے متہم نہیں کی جا سکتی۔ اگر ہم اس تاریخی حقیقت سے واقف ہوں کہ شیعہ، سنی، اسمٰعیلی خیمے باقاعدہ طور پر چوتھی صدی میں جا کر منقح ہو پائے۔ عباسی خلافت، جو امامت کی نظری تقسیم کے بعد سنی اسلام کا نقیب بن گئی، ابتداً آل بیت کی تحریک کے طور پر سامنے آئی تھی اور اسی حوالے سے آل عباس کے داعیوں کو اپنی خلافت کے استحکام کا موقع ملا تھا۔ اگر فاطمیین مصر پر قابض نہ ہوتے اور اگر اضمحلالِ خلافت کے سبب عین عباسی خلافت کے زیرِ سایہ آل بویہ کی امیر الامرائی قائم نہ ہوتی تو شیعہ، سنی اور اسمٰعیلی مسلمانوں کی الگ الگ شناخت منقح ہو پاتی اور نہ ہی اباضیوں کے لیے یہ موقع ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو اهل العدل والا ستقامة کے

نام سے متعارف کرا سکیں۔ گویا ہمارا شیعہ یا سنی ہونا منزل من اللہ نہیں، بلکہ ایک تاریخی حادثے کی باقیات کے طور پر ہے۔ کچھ یہی حال ہماری مسلکی شناخت کا بھی ہے جسے نہ تو اللہ نے ہمارے لیے منتخب کیا اور نہ ہی رسول اللہ نے چار یا آٹھ اماموں کے اتباع کی تعلیم دی۔ ابوحنیفہ، مالک اور شافعی کی علمی سرگرمیوں کا عہد دوسری صدی ہجری ہے، لیکن اس وقت اور اس کے بہت بعد تک مختلف بلاد وامصار میں اس پائے کے درجنوں اصحاب فن متحرک نظر آتے ہیں۔ سفیان ثوری، اوزاعی، ابن راہویہ اور جریر طبری جیسے ناموں کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔ اگر شاہ بیبرس نے جدال فقہی کے ازالے کے لیے بیک وقت چار متبادل فقہاء کا تقرر نہ کیا ہوتا اور آگے چل کر نویں صدی کی ابتداء میں برقوق نے حرم کعبہ میں چار متبادل فقہی مصلوں کا اہتمام نہ کیا ہوتا تو سنی اسلام ائمہ اربعہ کی اصطلاح سے ناواقف ہوتا اور آج ہم جس طرح ثوری، اوزاعی اور طبری کے فقہی مکاتب کے غیاب سے دین اسلام میں نقص نہیں پاتے، اسی طرح ائمہ اربعہ کے بغیر بھی ہماری مذہبی زندگی متحرک رہتی۔ ابن حنبل جنھوں نے متوکل کے عہد میں خلفائے اربعہ کا تصور وضع کیا اور جس کے بالمقابل خلیفہ بلافصل اہل تشیع کی پہچان بن گئی خود اپنے عہد میں، بلکہ بہت بعد تک، فقیہ کے طور پر تسلیم نہیں کیے جاتے تھے۔ فاطمیین کے ظہور میں آنے سے پہلے جمعہ کا خطبہ عقیدے کے بجائے سیاسی نقطہ نظر کا اظہار ہوا کرتا تھا۔ فاطمیین نے تفضیل پنجتن کو خطبہ کا حصہ بنایا جسے عباسیوں نے اپنے استحقاق خلافت کے دعووں کے ساتھ کچھ اس طرح ملحق کرلیا کہ انھیں سبیل المومنین کا آئینہ دار سمجھا جائے۔

علوم شرعیہ کی اصطلاح جس نے ہمارے ہاں دینی اور دینوی علوم کی ثنویت کے غیر قرآنی تصور کو عام کرنے میں اہم رول انجام دیا ہے، اس کے ذکر سے قرآن وحدیث کے صفحات خالی ہیں۔ ابو عبداللہ الکاتب الخوارزمی (متوفی ۳۸۷ھ) نے پہلی مرتبہ علوم شرعیہ کی اصطلاح استعمال کی جس نے آگے چل کر وارثین علوم نبوت کا ایک حلقہ پیدا کر دیا۔ دین کے نام پر منقسم اسلام کے یہ مدرسے جنھیں آج ہم سنّی یا شیعہ اسلام کا قلعہ سمجھتے ہیں، فاطمین اور عباسیوں کی سیاسی رقابت اور وقتی مصلحت کے سبب قائم ہوئے۔ ان کی باقیات کو جاری رکھنا اور انھیں اسلام کے قلعوں کی حیثیت سے دیکھنا تاریخ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

علماء کا مخصوص لباس جس میں وہ عام انسانوں سے الگ کوئی آسمانی مخلوق نظر آتے ہیں، اس کا بھی عہد رسولؐ اور عہد صحابہؓ میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اگر قاضی ابو یوسف نے قضاۃ کے لیے ایک منفرد لباس رائج نہ کیا ہوتا تو مسلم معاشرے میں عام مسلمانوں سے الگ علماء لباسی کا یہ منظر دیکھنے میں نہ آتا۔

تاریخ کے وہ بیانات جس نے شیعوں اور سنیوں کو مستقل فرقوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور جس کے سبب باہمی مغائرت بلکہ منافرت دین کا سا اعتبار حاصل کر گئی ہے، تاریخ و آثار کی یہ تمام کتابیں تیسری چوتھی صدی میں مرتب ہوئیں۔ اگر روایتوں کے ان مجموعوں کو مختلف فرقوں نے حسب توفیق تعبیری اور تشریعی مقام نہ دیا ہوتا یا یہ مجموعے بھی دوسرے بہت سے مجموعوں کی طرح تاریخ کے صفحات میں گم ہو گئے ہوتے، یا سقوط بغداد اور سقوط قلعۂ الموت کے وقت مخالفین کے ہتھے چڑھ گئے ہوتے تو آج ہمارا تاریخی وجدان بالکل مختلف ہوتا۔

اگر خلافت کے متحارب دعویداروں نے اہل صفا کے بھیس میں روحانی خلافت اور سلاسل کا ڈول نہ ڈالا ہوتا اور اگر فاطمی داعیوں نے خراسان، ملتان، دہلی واجمیر کی طرف اپنے اولوالعزم داعیوں کی سفارت نہ بھیجی ہوتی تو پیری مریدی، بیعت وخلعت کی اصطلاحوں سے ہم آشنا ہوتے اور نہ ہی دین کے نام پر سادہ لوح مسلمانوں کو خانقاہوں اور تکیوں سے وابستہ ہونے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ جماعتوں اور تحریکوں کی باقیات کا cult میں متشکل ہو جانے کا عمل تو ابھی کل کی بات ہے جب غیابِ خلافت میں ایک عمومی مایوسی کے سبب ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام کی عالمی مرکزیت اب ایک نا قابلِ عمل خیال ہے سو اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی امارتوں اور خلافتوں سے کام چلایا جائے۔ خیر کے کاموں میں شمولیت اور فاستبقوا الخیرات کی اسپرٹ تو ہمارے ایمان کا حصہ ہے البتہ cult جیسی فضا میں جینا اور اسی کے اندر امارت وخلافت کا قیام اور قائد کے لیے امیر المومنین جیسی اطاعت کا مطالبہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس دائرے کو دوام عطا کیے رکھنے کا عمل، یہ سب ایسی باتیں ہیں جو ہماری بحرانی تاریخ کی پیدا وار ہیں۔ انھیں مجبوراً انگیز تو کیا جاسکتا ہے ان کے حق میں کتاب وسنت سے دلیل نہیں لائی جاسکتی۔

اے کاش کہ ہمیں اس بات کا واقعی ادراک ہوتا کہ خدا نے صرف اپنی کتاب نازل کی اور اپنا رسولؐ بھیجا۔ آپ کی زندگی میں یہ دین اپنی تکمیل کو پہنچا۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہے وہ اہل ایمان کی تاریخ ہے جس میں عزیمت کے لمحات بھی ہیں اور لغزشوں کے امکانات بھی۔ انھیں اگر تاریخ کے طور پر پڑھا جائے تو

یہ ہمارے لیے باعث موعظت و عبرت ہوگی اور ہم مستقبل میں ماضی کی غلطیوں سے اپنا دامن بچا سکیں گے اور اگر اسے تشریعی اور تقدیسی حیثیت دے دی گئی تو حبل اللہ المتین ہمارے ہاتھوں سے پھسل جائے گی۔

متحدہ اسلام: امکانات واندیشے

گذشتہ ہزار برسوں سے ہم جس متوارث اسلام پر کار بند ہیں اور جس طرح ہم تاریخ کے مختلف ادوار میں متشکل ہونے والے مختلف تصورات کو دین قرار دیتے رہے ہیں، ایسی صورت حال میں یہ اندیشہ بالکل فطری ہے کہ اگر مروجہ دینداری کی بساط لپیٹ دی جائے تو پھر فقہی مسلمانوں کے دین کا کیا ہوگا۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ فقہاء ومحدثین کے بغیر نماز، روزہ، حج، زکوۃ کا انجام دینا مشکل ہو جائے گا۔ یہ مغالطہ عام ہے کہ مفسرین جب تک شان نزول کی بابت آگاہ نہ کریں ہم پر متن قرآنی کے معانی منکشف ہونگے اور نہ ہی متصوفین اور اہل اللہ کے بغیر ہمارے قلوب مراقبہ کی سکینت اور مشاہدہ کی تجلیوں سے منور ہو سکیں گے۔ گویا مروجہ دینداری پر خط تنسیخ پھیرنے سے فی نفسہ مذہب کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے اندیشے دین مبین کی ناقص تفہیم کے سبب ہے۔ ذرا غور کیجیے! ان فقہاء ومحدثین اور مفسرین و متصوفین کے ظہور میں آنے سے پہلے مسلمانوں کی ملی اور مذہبی زندگی کس طرح قائم ودائم تھی؟ تشریح وتعبیر کا باہمی اختلاف اور مختلف پالیسی امور پر مختلف آراء تو اس وقت بھی پائی جاتی تھیں لیکن اس کے باوجود امت کا متحدہ قالب برقرار تھا۔ ایسا اس لیے کہ غیاب پیغمبر میں قرآن مجید کو مرکزی حوالے کی حیثیت حاصل تھی۔

تب مکروہ ومباح کی بحثوں نے سرنہیں اٹھایا تھا اور نہ ہی کسی کے لیے ممکن تھا کہ وہ ایک جاری طرزِ عمل یعنی سنت ثابتہ مکشوفہ پر ایک حدیث قولی یا خبراحاد کے ذریعہ سوالیہ نشان لگا دیتا۔ تب خدا کی کتاب مبین اور مبرہن سمجھی جاتی تھی۔ کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آتی کہ یہاں کوئی بات خدا نے تشنہ چھوڑ دی ہے یا کوئی نکتہ سمجھائے جانے سے رہ گیا ہے جس کی تشریح وتعبیر کا فریضہ اسے انجام دینا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں سپردہ نفسوں کا ایک ایسا معاشرہ قائم کر دیا تھا جسے اپنی تاریخ کے اگلے تمام مراحل میں قرآن مجید کو نشان راہ کے طور پر برتنا تھا۔ گویا خدا کی کتاب اور رسول اللہ صلعم کا اسوۂ جانفزا ایک ایسی جیتی جاگتی خلاقانہ روایت کے طور پر متشکل ہو گیا تھا جہاں اہلِ ایمان کو رہبانیت، پاپائیت یا مشائخیت کے خلا کا احساس نہ ہوتا۔ آج بھی دین فقہا کے تشتت سے دامن بچانے والوں کو دین اسلام میں اسی وسعت اور حیات افزا تازگی کا احساس ہوگا جو کسی نئے پیغمبر کی آمد اور جامد رسوم دینداری کے خاتمے پر ہوا کرتا ہے۔ اسے شاید اس بات سے تو محرومی رہے کہ وضو کے فرائض چار ہیں یا چھ یا سات اور اس کی سنتیں یا نوافل کیا کیا اور کتنی ہیں، یا یہ کہ نماز میں رفع یدین، قرأت فاتحہ خلف امام یا آمین بالجہر کی کتنی اہمیت ہے لیکن فی نفسہ وضو اور نماز کی ادائیگی میں اسے کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ ایسا اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی قائم کردہ روایت عہد بہ عہد نسلاً بعد نسل ہمیں اس طرح منتقل ہوتی رہی ہے کہ ہم آج خود کو اس کڑی کے ایک تسلسل کے طور پر پاتے ہیں۔ اختلافات تو فقہاء کی موشگافیوں کی پیداوار ہیں یا راویوں کی متضاد روایتوں نے انھیں جنم دیا ہے۔ بھلا

بتائیے! ہم میں سے کتنے مسلمان ہیں جنھیں وضو کی سنتوں یا اس کے نوافل واستحباب کا علم ہے لیکن اس کے باوجود ہماری نمازیں جاری ہیں۔ دین کے نام پر فقہی موشگافیوں کی طویل طولانی بحثیں اور ضخیم وجیم دفاتر کا، سچ تو یہ ہے کہ متحرک عملی زندگی سے کچھ بھی علاقہ نہیں۔ ہاں جدال فقہی اور غیر ضروری مناقشوں کے لیے یہاں خاصا سامان پایا جاتا ہے۔ پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم ان ضخیم وجیم مجلدات کو نیست ونابود کرنے کی دعوت نہیں دے رہے ہیں، بلکہ انھیں صرف تشریعی مقام سے معزول کرنے کے داعی ہیں تاکہ ایک بار پھر مسلم معاشرے میں قرآن مجید کی مرکزی حیثیت بحال ہوسکے۔

یاد رکھئے! غیاب پیغمبر میں قرآن مجید ہی وہ واحد وثیقۂ وحی ہے جو تمام شکوک وشبہات سے بالاتر، تمام ہی اہل ایمان کے لیے، کم از کم نظری طور پر، متفقہ منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے مشن، اس کی ترجیحات اور اس کے غایت واہداف کا بیان خدا کی اس کتاب سے بہتر اور کہاں مل سکتا ہے؟ ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ وحی کے اس لازوال ماخذ کو آخری لمحہ تک اقوام عالم کی رشد وہدایت کا کام انجام دینا ہے۔ پھر یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ اس روشن کتاب کو ناسخ ومنسوخ، خاص وعام اور شانِ نزول کی ظنی تاویلات کے ذریعہ کالعدم قرار دے ڈالا جائے یا اس کی آیات احکام تو علمائے شرع اپنی مشقِ ستم کے لیے منتخب کرلیں اور آیاتِ اکتشاف وموعظۃ وحکمۃ کی ایک کثیر تعداد محض کتاب تلاوت بنا کر رکھ دی جائے۔

ہمیں توقع ہے کہ قرآن مجید کو نشان راہ کے طور پر برتنے کی یہ دعوت مکمل قرآن کو پھر سے ہمارے مطالعہ کی میز پر لے آئے گی۔ اور اگر ایسا ہوسکا تو نہ

صرف یہ کہ ذیلی مآخذ دین کا تشریعی اعتبار جاتا رہے گا، بلکہ خود علم کے سلسلے میں جو ثنویت مسلم معاشرے میں در آئی ہے اور جس کے سبب ہمارا فکری قافلہ عرصہ سے مستِ خرامی کا شکار ہے، اسے ایک بار پھر متحرک کیا جا سکے گا۔ یوں سمجھیے کہ فقہ و روایات کے دفتر اور تفسیر و تعبیر کے دواوین ایک ثقافتی ورثہ اور علمی تسلسل کے طور پر تو ہمارے درمیان باقی رہیں گے، لیکن کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ وہ قرآن مجید کی موجودگی میں قدماء کے قول یا فقہاء و مفسرین کی تاویلات کو حجت کے طور پر پیش کر سکے۔ یہ سب کچھ ایک ایسی صورت حال کو جنم دے گا جہاں کسی انسانی تالیف کے لیے حجۃ اللہ البالغۃ کا سا اعتبار جاتا رہے گا اور یہ حق صرف اور صرف خدا کی کتاب کے لیے مخصوص ہو جائے گا۔

ذیلی مآخذ کے ساقط الاعتبار ہو جانے سے ان مآخذ کی بنیاد پر بننے والے فرقے تحلیل ہوتے ہوئے معلوم ہوں گے۔ نہ سنی صحاح ستہ کی بنیاد پر دین کا کوئی علیٰحدہ قالب تشکیل پائے گا اور نہ ہی شیعہ کتب اربعہ کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ ائمہ اربعہ کے دواوین ان کی جلالت علمی کے سبب قابل استفادہ ضرور سمجھے جائیں گے، البتہ ان کے ساتھ ہی شیعی، اسمٰعیلی، اباضی اور ان تمام گروہوں کی تعبیری کتابیں بھی ہماری توجہ کی یکساں مستحق ہوں گی جن کا ماضی ہم سے پیوستہ اور مشترکہ رہا ہے اور جو تاریخ کے کسی لمحے میں بوجوہ ہم سے جدا ہو گئے۔ گویا تاریخی، تہذیبی اور تعبیری ادب کی بنیاد پر فرقہ بندی کی روایت دم توڑ دے گی۔ حتیٰ کہ کسی کے لیے اس بات کا موقع بھی نہ ہوگا کہ وہ خود کو قرآن جیسی عظیم کتاب کے حوالے سے ہی سہی ایک الگ طائفہ بتائے اور اپنے لئے

خدا کی عطا کردہ شناخت 'مسلمان' کو چھوڑ کر اہل قرآن جیسا لقب اختیار کرے۔
ہمارے خیال میں اگر قرآن کو واقعتاً مناقشہ کی کمان عطا کردی گئی تو فرقہ بندی کی گنجائش باقی نہیں رہ جائے گی۔ اور پھر فرقوں کے غیاب کے بعد علماء واحبار کے کارخانوں کی ضرورت بھی باقی نہ رہے گی۔ نہ کسی کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوگی کہ وہ فقہ مقارن کی کتابوں میں اختلاف فقہاء کے نظائر تلاش کرے، نہ قدماء کی کتابوں پر شرح درشرح لکھنے کا عمل علم وتحقیق کی معراج سمجھا جائے گا اور نہ ہی ضمیر کے مرجع کے سلسلے میں صفحات کے صفحات سیاہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ نہ فرسودہ کتب کلام ومنطق سے آلۂ فہم وتعبیر کے طور پر ہی سہی، اشتغال کی ضرورت محسوس ہوگی، نہ ہی اس امر کی تلاش میں عمریں گزریں گی کہ کس راوی کی ثقاہت مشتبہ ہے اور کسے واقعتاً لائق اعتبار سمجھا جاسکتا ہے۔ گویا انسانوں کے لیے کرنے کو بہت کچھ ہوگا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ علم کی جس ثنویت کے ہم صدیوں سے اسیر چلے آتے ہیں اور جس کے نتیجہ میں علوم شرعیہ اور علوم جدیدہ کی تقسیم نے ہمارے اندر دو مختلف اور متحارب قسم کے دماغ کو جنم دیا ہے، اس داخلی کشمکش اور تشتت کا یکسر خاتمہ ہوجائے گا۔ وحی ربانی سے ہر شخص اپنی توفیق بھر راست اکتساب کرسکے گا۔ علماء واحبار اور مشائخ ومفتیان کے غیاب میں طلب حق کے جویا خود کو ایک ایسی صورت حال میں پائیں گے جسے قرآن قل اللہ یفتیکم سے تعبیر کرتا ہے جہاں خدا کے فتویٰ کے آگے تمام فقہی موشگافیاں اور انسانی فتوے اپنا اعتبار کھودیتے ہیں۔

یقین جانیے! دینِ خالص جب اپنی اصل شکل میں ہمارے سامنے آئے

گا تو وہی غلغلہ انگیز جانفزا صورت حال پیدا ہوگی جس کا تجربہ پہلی نسل کے مسلمانوں کو ہوا تھا۔ دین تو نام ہے غیر مشروط سپردگی کا۔ اس کے برعکس رسوم عبودیت پر دین کا گمان کرنے والے ایک جامد قسم کی مذہبیت کو ہی جنم دے سکتے ہیں۔ عہد رسولؐ کے مکہ میں، جب خدا کا آخری پیغام نازل ہو رہا تھا، رسوم دینداری کی کمی نہ تھی۔ مکہ مذہب پرستی کا گہوارہ تھا، جہاں صوم وصلوٰۃ کے مظاہر اور طواف وزیارت کے رسوم بڑے منضبط انداز سے جاری تھے، لیکن قرآن مجید نے مذہب کے اس کاروبار کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا:

ارایت الذی یکذب بالدین......الخ

لوگو! کیا تم اس شخص کو نہیں جانتے جو دین کے پردے میں دین کی نفی کرتا ہے؟ اس کی پہچان یہ ہے کہ یہ یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ سو پھٹکار ہو ایسے نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں، جو محض دکھاوا کرتے ہیں اور جو معمولی چیزیں دینے سے بھی منع کر دیتے ہیں۔ (مفہوم سورۃ الماعون)

دین جب مذہب کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اور جب دین کے غایت واہداف کے بجائے متبعین کی تمام تر توجہ رسوم کی جامد پاسداری پر مرکوز ہو جاتی ہے تو پھر معاشرے میں ایسے علماء کا ایک طبقہ بھی وجود میں آ جاتا ہے جو ان رسوم کی باریک بیں تفصیلات کی ترتیب وتدوین پر ہمہ وقت مستعد رہتا ہے۔ یہی وہ چور دروازہ ہے جس سے مشائخیت خدا اور بندے کے بیچ میں آ بیٹھتی ہے۔ پھر دین مشائخیت کے سیاسی واقتصادی مفادات کی حفاظت کا نام رہ جاتا ہے جیسا کہ قبل

اسلام کے ملی معاشرے کا حال تھا اور جس پر قرآن کی یہ تیز و تند تنقید ہم نے ازراہِ مثال پیش کی۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، احبار کا عروج وحی ربانی کے راست اکتساب میں ہمارے لیے حجاب بن جاتا ہے۔ پھر مختلف انسانوں کے ذاتی فہم کو تقدیس و استناد عطا کرنے کے نتیجہ میں مختلف فرقے وجود میں آتے ہیں۔

آج امت مسلمہ صدیوں کے تاریخی انحراف کے بعد بدقسمتی سے ایک ایسے مقام پر آ پہنچی ہے جہاں اس کی داخلی اصلاح کے بغیر نہ تو خود اس کا کوئی مستقبل ہو سکتا ہے اور نہ ہی اقوام عالم کے لیے وہ دوبارہ منارہ نور بن کر سامنے آ سکتی ہے۔ تاریخ کے ایک ایسے موڑ پر جب سرمایہ داری کا سورج غروب ہوا چاہتا ہے اور جب ایک نظری اور فکری خلاء نے مستقبل کے سلسلے میں سخت مایوسی کی کیفیت پیدا کر دی ہے، آخری وحی کے حاملین پر لازم ہے کہ وہ غیابِ پیمبری میں اقوام عالم کی ہدایت کے لیے سامنے آئیں اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ خود ہم اس نظری تشتت اور داخلی خانہ جنگیوں سے ماوراء متحدہ پیمبرانہ اسلام کا واقعی شعور نہ رکھتے ہوں۔ جب تک ہمارا گھر درست نہ ہو ہم باہر والوں کی رشد و ہدایت کا کام کیسے انجام دے سکتے ہیں؟ اب وقت آ گیا ہے کہ قافلۂ انسانی کی ازسرِ نو ترتیب اور اس کی سمت و رفتار کی درستگی کے لیے آخری وحی کے حاملین دوبارہ دنیا کے سامنے آئیں۔

اس کتاب کی اشاعت ہماری ہزار سالہ فکری تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ اگر اسے کھلے دل ودماغ سے پڑھا جائے تو عجب نہیں کہ یہ مختصر سا کتابچہ ایک نئی تبدیلی کا نقطۂ آغاز بن جائے۔

ہمارا شیعہ یا سنی ہو جانا، یا اسماعیلی اور اباضی کہلانا، یا حنفی، شافعی، زیدی، جعفری کے خیموں میں بٹ جانا، یا بریلوی، دیوبندی، جماعتی اور سلفی شناختوں کا اختیار کر لینا ہماری تاریخ کا پیدا کردہ انحراف ہے جس نے گذرتے وقتوں کے ساتھ اتنے مختلف اور متحارب فرقوں کو جنم دیا کہ امت کی قوت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔ آج دنیا کے دگرگوں حالات ہم سے اس بات کے طالب ہیں کہ اقوامِ عالم کی رہنمائی کے لئے آخری نبی کی امت فی الفور سامنے آئے۔ اور یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ خود ہمارا گھر درست نہ ہو۔

وحی کی روشنی اور تاریخ کا مطالعہ ہمیں اس بات پر مطلع کرتا ہے کہ ہمارے سامنے دو ہی متبادل ہیں یا تو ہم آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے سیادتِ عالم کی کمان سنبھالنے کے لئے خود کو تیار کریں یا، بصورتِ دیگر، معزول امتوں کی طرح خدا کے غضب اور تاریخ کے کباڑ خانے کو اپنے مقدر کے طور پر قبول کر لیں۔



مختلف زبانوں میں مصنف کی کتابیں مفت ڈاؤن لوڈ کے لئے دستیاب ہیں

www.RashidShaz.com

کتابوں کی آن لائن خریداری کے لئے تشریف لائیں:

www.BarizMedia.com

مصنف کی ادارت میں شائع ہونے والے کثیر لسانی بین الاقوامی مجلّہ کے تمام شمارے مفت

www.EutureIslam.com



9 879381 461105